5

آرٹ کا جدلیاتی تصوّر

فیض ۔ شعلہ رخسار حقیقت

ٹارچر : چند عمومی اور خصوصی نفسیاتی پہلو

برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات

فلسفہ

سیاسی معاشیات

تاریخ

سوشیالوجی

نفسیات

ادب

مجموعہ نمبر ۵
ریسرچ فورم پبلی کیشنز
پوسٹ آفس بکس ۳۵۱۱
کراچی نمبر ۵

ناشر :۔ ریسرچ فورم پبلی کیشنز
کراچی
تقسیم کار :۔ مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز۔۲ عبداللہ ہارون روڈ
کراچی
مطبع :۔ احمد برادرز پریس کراچی
طبع اوّل :۔ دسمبر ۱۹۸۶ء
قیمت :۔ ۱۲ روپے

فہرست

آرٹ کا جدلیاتی تصوّر

اسلم اظہر

صنعتی معاشروں میں خواہ وہ بورژوا معاشرے ہوں یا سوشلسٹ، گزشتہ عشروں میں ایک ایسی جدید سائنس وجود میں آئی ہے جس نے سائنس کی دنیا میں زبردست تغیر پیدا کردیا ہے۔ اس سائنس کا نام CYBERNETICS سائبر نیٹکس ہے۔ اس کی مدد سے انسان کیلئے فطری قوتوں پر اس حد تک قابو پانا ممکن ہوگیا ہے جس کی آج سے چند سال پہلے تک سائنس فکشن کے سب سے پُرتخیّل مصنفین بھی پیش بینی نہیں کر سکتے تھے۔ ان امکانات کے نتیجے میں اب کہا جاسکتا ہے کہ صنعتی معاشرے، ایک دوسرے صنعتی انقلاب کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

ظاہر ہے کہ سائبر نیٹکس کا پاکستان کے معاشرے سے کوئی تعلق نہیں۔

انسان میں جو دو عظیم تعقّلی صلاحیتیں موجود ہیں ان میں سے ایک سائنس ہے۔ دوسری صلاحیت آرٹ ہے۔ جہاں سائنس طبعی کائنات کی گہرائیوں کا انکشاف کرتی ہے، آرٹ، فطرت اور معاشرے میں انسان کی زندگی کے عمومی اصولوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

سائنس اور آرٹ ایک ساتھ جیتے ہیں، ایک ساتھ بڑھتے ہیں اور ایک دوسرے کو توانائی فراہم کرتے ہیں، وہ زندگی کے رفیق ہیں۔ آج کے انسانی معاشرے میں ان دونوں کا لازم و ملزوم کا تعلق ہے۔

صنعتی معاشروں میں آرٹ بھی سائنس کے ساتھ ساتھ نمو پاتا ہے۔ سوشلسٹ معاشروں

میں آرٹ زیادہ بامقصد ہوتا ہے۔ بورژوا معاشروں میں وہ مقصد کا متلاشی ہوتا ہے، لیکن دونوں میں وہ سماجی ترقی کے حصول کے لئے ایک توانا قوت ہے، بالکل سائنس کی طرح۔

آرٹ اور سائنس فطرت کے خود مختار اعضا نہیں ہیں، اور ان کا انسانی معاشرے سے الگ کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہ بڑھتے ہیں اور تبدیل ہوتے ہیں۔ کبھی وہ جوہڑ بن جاتے ہیں۔ کبھی ایک سست رفتار دریا اور کبھی ایک بپھرا ہوا سیل رواں، اور سماجی ضرورتیں ہی ان سب کا تعین کرتی ہیں۔

تو پھر سائنس اور آرٹ کا پاکستانی معاشرے سے کیا تعلق ہے؟ اس سوال کو سامنے لانا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے جواب میں یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ہم سائنس اور آرٹ کے باہمی رشتے، اور ان دونوں کے معاشرے سے رشتے کو ٹھیک طور پر متعین کریں اور چونکہ پاکستان میں سائنس اور آرٹ کو قومی ترقی کے ضمن میں ایک غیر سنجیدہ سرگرمی سمجھا گیا ہے، اور ہر آنے والی حکومت نے زندگی کی ان دونوں شاخوں کی مستعدی سے حوصلہ شکنی کی ہے، یا کم از کم انہیں پنپنے سے روکے رکھا ہے، لہذا اب ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس مسلسل حوصلہ شکنی کے اسباب کا پتہ لگائیں۔

اس مقالے میں پاکستانی معاشرے میں آرٹ کے مقام کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بحث کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم، خود اس معاشرے کی خصوصیات کا بھی جائزہ کے تحت یا سورماؤں اور جابروں کے اعمال کے نتیجے میں نہیں ابھرتے یا مٹتے ان کی زندگی عمومی قوانین کے تابع ہوتی ہے، اور ان قوانین کا اطلاق دوسرے خطوں میں بھی رہا ہے اور تاریخ کے مختلف لمحوں میں بھی، پاکستان کے تجربے کو حالیہ اور ماضی کے معاشروں سے جوڑ کر دیکھنے سے، یعنی ایک تاریخی تناظر اپنانے سے، یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ ہم عصر حقیقتوں کی ایک روشن تصویر اور ایک سائنسی ادراک حاصل ہو۔ آرٹ کے مختلف شعبوں کا

مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُن عمومی اصولوں پر روشنی ڈالنے کے لئے جو زندگی سے
آرٹ کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ ہم آرٹ کی کسی ایک شاخ سے اپنی گفتگو کا آغاز کریں۔ اس
مقالے میں آغاز میں تھیٹر کی مثال کو لیا گیا ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ آرٹ کی
دنیا میں تھیٹر کو ایک امتیازی حیثیت دے دی جائے۔ بلکہ اس بحث میں داخل ہونے کیلئے
یہ ایک سہل نقطۂ آغاز ہے۔ مزید یہ بھی کہ چونکہ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تھیٹر ایک ایسا میدان
ہے جس پر میں کچھ مہارت رکھتا ہوں، تو میں نے سوچا، مناسب ہوگا کہ انہیں مایوس نہ
کیا جائے۔

* * *

۱۹۲۰-۳۰ء کے عشروں میں سینما نے تکنیکی اور موضوعاتی پختگی اختیار کرنا شروع
کی اور شوبزنس کے ستاروں کی دنیا میں ہالی وڈ کا ستارہ سب سے روشن نظر آنے لگا تو شمالی
امریکہ اور مغربی یورپ میں لوگوں نے اچھی طرح جان لیا کہ ایک باضابطہ ادارے کے طور پر تھیٹر
تفریح کے متلاشی عوام کے دلوں پر کئی صدیوں کی بلا شرکتِ غیرے حکومت کے بعد شاخ
پر ہی مرجھا جائے گا۔ اور یہ کہ اب سینما، عوام کی وفاداریوں اور باکس آفس کی دولت کو کھینچ
لے جائے گا۔ اور تھیٹر قبل از صنعتی عہد کی ایک بے جان علامت بن کر رہ جائے گا، اور اگر
یہ کچھ دیر اور زندہ رہا بھی، تو اس کی حیثیت عجائب گھر میں پڑی ہوئی شے سے زیادہ نہیں ہوگی
اُس قدیم عہد کی ایک انوکھی یاد۔

جب ڈرامہ دیکھتے وقت، تماش بینوں کو خود یہ تصور کرنا پڑتا تھا کہ اسٹیج پر فوجیں
دوڑ رہی ہیں کیونکہ بیچارے اداکار تو گھوڑوں اور فوجوں کو لکڑی کے اُس چھوٹے سے اسٹیج
پر لانے سے قاصر تھے۔ مختصراً یہ سمجھ لیا گیا کہ تھیٹر کی سماجی ضرورت بھاپ بن کر اُڑ جائے گی لیکن
یہ تصور ایک واہمہ ثابت ہوا۔

یہ صحیح ہے کہ سینما گھر زیادہ سے زیادہ لوگوں سے بھرنے لگے اور ۵۰ء کے عشرے میں
جب اگلی بڑی تکنیکی ایجاد، ٹیلیویژن، نے خاندانی زندگی میں اپنا مقام بنا لیا تو زیادہ سے

زیادہ لوگ ٹی وی سیٹ کے سامنے زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے لگے اور ٹی وی نے انہیں تفریح اور معلومات کا ایسا مکسچر فراہم کیا جو تھیٹر انہیں کبھی نہیں دے سکتا تھا۔

لیکن صنعتی معاشروں کی اس ناقابلِ مزاحمت ثقافتی یلغار کے باوجود تھیٹر زندہ رہا چیخوف ابسن اور شیکسپئیر زندہ رہے اور اُن کے ساتھ ڈرامہ نگاروں کی ایک نئی کھیپ تخلیقی جنون کے ساتھ آگے بڑھی جن میں سب سے پیش پیش بریخت تھا، اور ان سب کی کاوش یہ تھی کہ بیسویں صدی کی زندگی کے ہم عصر تجربے اور نگاہ کے نئے زاویے کی تقطیر کو ۱۲×۵ میٹر لکڑی کے اسٹیج سے پیش کیا جائے۔

تھیٹر کی اس جاندار اور دیرپا کشش کو سمجھنے کے لئے، اور یہ جاننے کے لئے بھی کہ باوجودیہ کہ ٹی وی اور سینما تھیٹر کے مقابلے میں زندگی کی کہیں زیادہ بھرپور، مکمل اور حقیقی عکاسی کرتے ہیں، اس پر حاوی نہیں ہوسکے، ضروری ہے کہ ہم آرٹ کی دنیا کے اُس عام سے آلے کو پرکھیں جو عموماً قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا، یعنی "استعارہ"۔

استعارے کے لغوی اور روزمرہ معنوں سے ہم سب واقف ہیں اور استعارہ ہمارے ساتھ کم از کم اُس قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے جب جنگلی انسان نے اپنی غاروں کی مصوری کے جادو کے ذریعے جنگلی درندوں پر غلبہ پانا چاہا، اور پھر قدیم یونان کے مفکروں نے پرومیتھیس کی روایت تخلیق کی، اور ہمارے اپنے وقت میں شاعر نے اعلان کیا کہ "پھر برق فروزاں ہے سرِ وادئ سینا"۔

یہ تمام استعارے تھے، اور حقائق کو پیش کر رہے تھے اور ہم سب جانتے ہیں کہ انسانی ذہن پر اُن کا اثر شدید اور گہرا رہا ہے۔ جو شدید اور گہرا نہ ہوتا اگر یونان کے دانشوروں نے تفصیل اور بیانیہ انداز میں بتایا ہوتا کہ اب ضروری ہو گیا ہے کہ عام آدمی اپنی تقدیر کا فیصلہ اپنے ہاتھوں میں لے لے (یعنی پرومیتھیس کی روایت) یا فیض نے اعداد و شمار کی مدد سے نوآزاد ممالک پر سامراج کی گرفت کو بیان کیا ہوتا۔

آرٹ کی اقسام میں ناول ایک استعارہ ہے جبکہ ایک بیانیہ اور تنقیدی مضمون استعارہ نہیں ہے۔ شاعری استعارے کی اور بھی ارفع و اعلیٰ شکل ہے اور اسی طرح مصوّری بھی فنکارانہ اظہار کی سب سے ارفع و اعلیٰ استعاراتی شکل موسیقی ہے۔

تو پھر استعارہ ہے کیا؟ اور اس کا جادوئی اثر کہاں سے آتا ہے؟ اور یہ اثر ہے کیا؟ اور استعارے کا اس بات سے کیا تعلق ہے کہ تھیٹر کا ناقابلِ مزاحمت وجود اپنی سماجی موت کی طرف نہیں بڑھتا۔

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس بحث کا نقطۂ آغاز ہمیں آرٹ کی دنیا میں نہیں بلکہ حیاتیاتی علوم میں ملتا ہے، اور اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آرٹ اور سائنس کی لازمی اور نامیاتی اکائی انسان کے اس دنیا کو سمجھنے اور تبدیل کرنے کے عمل کی مظہر ہے۔

تمام جاندار مادّہ اپنے ماحول سے مطابقت ADAPT اختیار کرتا ہے۔ جاندار مادے کی یہ طبعی اور نامیاتی صفت ہے۔ جو اسے کام کرنے پر مجبور کرتی ہے تاکہ وہ ماحول سے مطابقت اختیار کرے اور یوں اپنی بقاء کو یقینی بنائے۔ علاوہ ازیں یہ کہ یہ ساکت نہیں بلکہ ایک جدلیاتی صفت ہے۔ کیونکہ اپنی بقاء کے سلسلۂ عمل میں جاندار مخلوقات محض ایک ارتقائی سطح پر نہیں رُکی رہتیں بلکہ مختلف نئی طبعی جہتیں اختیار کرتی رہتی ہیں، اور ان جہتوں کی مدد سے وہ فطرت کے ساتھ اپنی مسلسل جدوجہد میں نئی صلاحیتوں کا اظہار کرتی ہیں۔

جاندار مخلوقات کے ارتقاء میں انسان کے عہد تک آخری اور قطعی طبعی جہت انسان کا دماغ ہے، اور فطرت کے دیگر اعضاء کی طرح دماغ بھی ساکت اور بیکار نہیں رہ سکتا بازو اور ٹانگ کے پٹھوں کی طرح دماغ کے خلیوں کی بھی یہ طبعی ضرورت اور مجبوری ہے کہ وہ حرکت کریں، ورزش کریں، صحت مند رہیں، اپنے آپ کو قائم رکھیں اور آگے بڑھیں۔

عام اصطلاح میں تجسّس انسانی دماغ کا بنیادی اور مستقل مظہر ہے۔ اپنی نامیاتی صفت کے باعث دماغ کام کرنے پر مجبور ہے۔ یہ جب سرگرم ہوتا ہے تو خوش رہتا ہے اور جب بیکار ہوتا ہے تو تخویف محسوس کرتا ہے اور غیر مطمئن رہتا ہے۔

رابطے کے طریقۂ کار کے حوالے سے بیانیہ یا نثری طریقے میں اور استعارے میں ایک اہم اور بنیادی فرق ہے۔ کسی اطلاع یا تخیّل کی رسائی کے لئے نثری طریقۂ کار خصوصی سے شروع ہوتا ہے اور پھر بتدریج ایک منطقی سلسلے کے ذریعہ عمومی تک پہنچتا ہے۔ ہر قدم پر دلیل پیش کی جاتی ہے اور قبول کنندہ دماغ بہت زیادہ محنت کیے بغیر خصوصی سے عمومی تک کے منطقی سلسلے کو بآسانی سمجھ جاتا ہے۔ یہ نثری سفر ایک پیش پا افتادہ سفر ہے کیونکہ تجر بدی فکر کا اصل اور لطف اندوز کرنے والا کام مطالعہ کنندہ کے لیے خود مصنف کا جھکاؤ ہوتا ہے۔

اس کی مخالف سمت کا سفر یعنی عمومی سے خصوصی تک کا سفر ایک ایسا سفر ہے جو قبول کنندہ ذہن کو ایک زیادہ بلند سطح پر تخلیقی کام میں ساتھ لیکر چلتا ہے، اور یہ ہے استعارے کا طریقۂ کار۔ استعارہ براہ راست جست لگا کر عالمگیریت کے عمومی اصول تک پہنچتا ہے اور یہ کام قبول کنندہ ذہن پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود اُن خصوصی حقائق تک واپسی کا سفر طے کرے جن سے جامع عمومی اصول اخذ کیا گیا تھا۔

لیکن "قبول کنندہ ذہن پر چھوڑ دینے" سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، یوں لگتا ہے کہ استعارے کا طریقۂ کار ذہن پر کوئی ناپسندیدہ بار ڈال رہا ہے۔ جس سے غیر استعاراتی یا نثری طریقۂ کار کے استعمال سے اجتناب کیا جا سکتا۔ لیکن اگر کلچر کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی ناگوار بوجھ نہیں ہے، بلکہ یہ کہ انسانی ذہن استعارے کے استعمال کا خیر مقدم کرتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ دماغ کام کے ہر موقع کا خیر مقدم کرتا ہے۔

عام تجربہ بتاتا ہے کہ نثر کے مقابلے میں شاعری کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز

ہونے میں ذہن کو زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ شاعری اپنے موضوع کو تفصیل سے بیان نہیں کرتی۔ یہ اپنے اظہار میں بہت سے خالی خانے چھوڑ دیتی ہے۔ یہ آڑے ترچھے کنائے استعمال کرتی ہے، بلاکے، شارٹ کٹس، سے کام لیتی ہے، اور لفظوں کی دولت کو اس کنجوسی سے صرف کرتی ہے جیسے کوئی بخیل اپنا پیسہ خرچ کرتا ہے۔

چنانچہ شاعری کا مطالعہ کرنے والے ذہن کو اُسی مناسبت سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ خالی خانے پُر کرے، نظم کے عمومی برتاؤ سے اپنے لئے خصوصی موزونیت RELEVANCE اخذ کرے، استعاروں کو سلجھائے اور ان کا تار تجربے کے منبع سے جا ملائے۔ اور ذہن اس عمل سے خوش ہوتا ہے۔ شاعری کی مستقل اپیل اور اس کے جادو کی یہی بنیاد ہے۔ چنانچہ آج کمپیوٹر، خود کار مشینوں اور محنت کی بچت کے عام تکنیکی اصولوں کے اس دور میں بھی شاعری زندہ ہے، تابندہ ہے۔

مثلاً آج بھی غالبؔ کے سب سے مشکل اشعار کے تہ در تہ معنوں پر بحث جاری ہے۔ یہ بحث ہمیں مشکلاتِ غالبؔ سے برانگیختہ نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس ہمیں ذہنی اور قلبی مسرت بخشتی ہے، وہی مسرت جو آئن اسٹائن جیسی کوئی شخصیت، بغیر کسی خارجی دباؤ کے، فطرت کے دقیق قوانین کا مطالعہ کر کے حاصل کرتی ہوگی۔

شاعری کی طرح یہی بات مصوّری اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اور بالخصوص موسیقی کے بارے میں، جس میں سامع کے ذہن کو وہ ساری کیفیات، مناظر واقعات اور تجربات خود اپنے طور پر تصوّر میں لانے پڑتے ہیں اور ازسرِنو تخلیق کرنے پڑتے ہیں۔ جو سُروں کے ملاپ کی ان گنت سرگموں میں پائے جاتے ہیں۔

اور یہی بات تھیٹر کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، جو آرٹ کی ایک استعاراتی شکل ہے۔ تھیٹر تماشائی کی تخیّلاتی قوتوں پر بہت کچھ چھوڑ دیتا ہے۔ چند علامتی الفاظ اور اُن کی ادائیگی سے، اور محض اشاروں کے ذریعے، دیواریں اور چھتیں، بڑے شہر اور جنگل، دولت

اور غربت کے مظاہر دکھائے جا سکتے ہیں۔ اور پھر یہ تماشائی کا کام ہے کہ تھیٹر کے استعارے سے اُن تمام رنگوں اور آوازوں کو ازسرِ نو تخلیق کرے جو حقیقی زندگی کا جوہر ہیں۔

تھیٹر میں۔ اور یقینی طور پر اعلیٰ تھیٹر میں۔ ناظرین کی مفعولیت ناممکن ہے، کیونکہ تھیٹر کے ناظرین کو ہضم شدہ غذا نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ وہ خود اپنے ہاضمے کو بروئے کار لانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور تھیٹر افیون نہیں ہو سکتا۔

پرفارمنگ PERFORMING آرٹ کی تاریخ بتاتی ہے کہ تھیٹر کے ناظرین اس تجربے سے مسرور ہوتے ہیں۔ اور کھیل دیکھتے وقت وہ ذہنی محنت کی ذمہ داری سے بالکل نہیں کتراتے جب ہم باہمی رشتے اور اُس قابلِ احساس دو طرفہ فورس فیلڈ FORCE FIELD کا ذکر کرتے ہیں جو اداکاروں اور ناظرین کے درمیان پایا جاتا ہے، تو یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس رشتے کی بنیاد اس حقیقت پر مبنی ہے کہ نہ صرف اداکار بلکہ خود ناظرین بھی کام میں مصروف ہیں یہ رشتہ تھیٹر کی ایک مخصوص اور منفرد صفت ہے، جو ٹی وی اور سینما کے ناظرین میں نہیں پائی جاتی۔

عام طور پر ٹی وی اور سینما کے معمول کے کاروباری پہلو سے ٹی وی اور سینما کا تھیٹر سے وہی رشتہ ہے جو نثر کا شاعری سے ہے۔ سینما اور ٹی وی ہم تک تفصیلات سے بھرپور آتے ہیں۔ اور انہیں صرف "خصوصی" سے غرض ہوتی ہے۔ وہ اپنی لامحدود حرکت پذیری کے باعث اپنے ناظرین کو حقیقی زندگی کی تمام آوازیں اور رنگ دکھانے کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لیتے ہیں۔ وہ عظیم الشان طریقے سے اور بے رحمانہ حد تک زندگی کا حقیقی اظہار کر سکتے ہیں وہ ہمیں تاریخ کے بعید ترین ادوار میں لے جا سکتے ہیں خواہ وہ ماضی میں ہوں یا مستقبل میں وہ ہمیں دور دراز ستاروں تک پہنچا دیتے ہیں اور رنگ اور آواز کی کسی تفصیل کو نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ زندگی کی حقیقی صورتحال کو لیتے ہیں، اسے ہضم کرتے ہیں اور ناظرین کے سامنے اُگل دیتے ہیں۔ ناظرین اپنے جذباتی ردعمل کو تیار رکھتے ہیں اور اکتائے جانے کے منتظر ! یہاں

آپ ہنسیں گے!، یہاں آپ آنسو بہائیں گے!، "یہاں آپ آہ بھریں گے یا شاید چیخیں گے!"
"یہاں آپ خوف کے مارے اکڑ کر رہ جائیں گے!"، آپ سوچ رہے ہیں کہ لڑکی کے گال پر وہ
نشان کیسا؟ وہ فوراً آپ کو اس کا کلوز اپ دکھائیں گے۔ اچھا تو یہ خنجر کا نشان ہے، اور ایک
اور روشن کلوز اپ لڑکی کی آنکھوں میں پائی جانے والی دہشت کو نمایاں کر دے گا۔ لیکن یہ آوازیں
کیسی؟ "کٹ!"، موٹر بائیک کے پہیے، زانیوں کی ایک ٹولی سرگرم۔ اور اُن کے چہروں پر خوفناک
داڑھیاں، آنکھوں پر سیاہ چشمے، ہونٹوں پر لجلجی مسکراہٹ۔ اور موٹر انجنوں اور چیخوں کا
اسٹیریو STEREO شور۔

اب تخیل کے لئے کیا بچا؟ بمشکل کچھ۔ ذہن کیلئے؟ کچھ بھی نہیں۔ آپ کی لبلبی دبائی
گئی اور آپ متحرک ہوئے۔ ٹی وی اور سینما کے کاروباری روپ کا تجربہ تھیٹر کے تجربے سے
کیفیتی اعتبار سے مختلف ہے۔

یقیناً لوگ ٹی وی اور سینما پر اُمڈ پڑتے ہیں، اور بظاہر یہ منظر ہمارے اُس دعوے کی
تردید کرتا ہے کہ ذہن کام کرنے کے مواقع کا متلاشی ہے۔ یہ تضاد اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہم
ٹی وی، سینما اور تھیٹر کو ایک ہی شعبے میں ڈال دیتے ہیں، یعنی شو بزنس کے شعبے میں۔ اور
اس میں شک نہیں کہ یہ سب شو بزنس کی شکلیں ہیں۔ حالانکہ یہ امر بھی دلچسپی کا باعث ہے
کہ شو بزنس کی اصطلاح ایک جنرک GENERIC نام کے طور پر اُس وقت عام استعمال
میں آئی جب سینما پختہ کار ہو چکا تھا اور جب شو بزنس واقعی بزنس بن گیا تھا۔ ایک بہت
بڑا بزنس لیکن وہ دعویٰ اپنی جگہ صحیح ہے کہ تھیٹر کا تجربہ بڑے اور چھوٹے اسکرین سے کیفیتی اعتبار
سے مختلف ہے۔ تھیٹر ذہنی کام کے مواقع فراہم کرتا ہے، اور ٹی وی اور سینما ذہنی آسودگی، انسان
کو دونوں کی ضرورت ہے۔ لوگوں کی اکثریت روزی کمانے کی جنونی دوڑ میں پھنسی رہتی
ہے، چنانچہ بیزار کن، دن کے خاتمے پر، وہ صرف اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ٹی وی
کے سامنے گرا دیں۔ تھکن سے چور، ذہنی طور پر سوئے ہوئے منفعلی کیفیت میں مبتلا،

اور اِس حالت میں کہ ان کی لبلبی دبائی جائے اور وہ لاشعوری طور پر حرکت میں آجائیں۔

اس مقالے میں ہم چونکہ معاشرے میں آرٹ کی افادیت کا سائنسی جائزہ لے رہے ہیں مناسب ہوگا کہ ہم ذرا انعکاسی یا لاشعوری ردِعمل اور شعوری اور فکری ردِعمل پر غور کرتے چلیں۔ حیاتیاتی بحث کی تفصیلات میں جائے بغیر جو کہ بہرحال اس مقالے کے دائرے اور موضوع سے خارج ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس عمل کو ہم جسم کا انعکاسی ردِعمل قرار دیتے ہیں اس کا تعلق اعصابی نظام کے اُن خلیوں سے ہے جنہیں "نیوران" کہا جاتا ہے نیوران میں یہ نامیاتی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ہر خارجی تجربے کو اپنے اندر محفوظ کر لیتے ہیں۔ یوں وہ ایک خود کار یادداشت کا عمل سرانجام دیتے ہیں اور اس یادداشت کو خودکار طریقے سے واپس حرکت میں لایا جا سکتا ہے۔ جب انہیں کوئی ایسا تجربہ متحرک کرتا ہے جو ان کی یادداشت میں محفوظ ہو، وہ ردِعمل کے طور پر جسم کے مختلف حصّوں کو مخصوص حکم کے پیغام بھیجتے ہیں تاکہ جسم اُس خارجی محرک تجربے سے نمٹ سکے۔ ہوسکتا ہے کہ اس دوران دماغ کا شعوری حصّہ کسی بالکل مختلف موضوع کے بارے میں سوچ رہا ہو یا پھر کچھ بھی نہ سوچ رہا ہو۔

چنانچہ جب میں کار چلاتا ہوں تو میرے انعکاسِ مشروط عمل میں آجاتے ہیں۔ میں گاڑی کو آہستہ کرتا ہوں، گیئر بدلتا ہوں، چوراہے پر رُکتا ہوں اور موڑتا ہوں اور یہ سارے کام نہایت خوش اُسلوبی سے سرانجام دیتے ہوئے، میں بیک وقت کسی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے دوست کے ساتھ شعوری سطح پر گفتگو بھی کر سکتا ہوں۔

ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے بھی یہی کیفیت ہوتی ہے، قہقہے، آہیں، چیخیں، خوف یہ ساری کیفیتیں ناظر میں انحطاطِ مشروط کے نتیجے میں متحرک ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہوسکتا ہے کہ اُس کا شعوری دماغ خوابیدہ اور آسودگی کی کیفیت میں ہو۔ کیونکہ شعوری دماغ کے لئے کرنے کو کچھ نہیں ہے۔

تھیٹر کی صورتحال بالکل مختلف اور امتیازی ہے۔ اپنی استعاراتی نوعیت کے باعث تھیٹر ذہن کے لئے ایک محرک قوت ہے۔ بالکل اعلیٰ شاعری کی طرح۔ آرٹ کے یہ دونوں مظاہر، انسان سے فعال شمولیت طلب کرتے ہیں اور اگر انسان کا ذہن بالکل ہی تھکا ہوا نہ ہو، تو وہ ان محرکات کا خیر مقدم کرتا ہے۔

یہ ہے انسانی ذہن کی نامیاتی صفت، ذہن کام کرتا ہے اور کام کرتے ہوئے خود کو اور دنیا کو بدلتا ہے۔

اور یہی ہے آرٹ کی صفت، جس وقت معاشرے میں وہ معروضی شرائط اور موضوعی عناصر موجود ہوں، جو اُسے تبدیلی کیطرف مائل کرتے ہیں اور کام کرنے اور بڑھنے پر مجبور کرتے ہیں تو اُس معاشرے کی ضرورت اور مجبوری بن جاتی ہے کہ وہ اپنے اجتماعی، سماجی ذہن اور شعور کو حرکت میں لائے۔ یوں کہیئے کہ کلچرل غذائیت اُس کی نامیاتی ضرورت بن جاتی ہے۔ آرٹ اظہار کی اپنی تمام استعاراتی شکلوں سمیت۔ ادب، مصوری، موسیقی، تھیٹر اور سینما بطور آرٹ، جسے ہم سینما بطور صنعت سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں۔ یہ تمام مظاہر باشعور سماجی ذہن کی کلچرل ورزش گاہیں ہیں۔

* * *

تاریخ میں ایسا وقت آتا ہے جب معاشرے پر زوال آجاتا ہے، پرانے پیداواری رشتے متروک اور پست ہو جاتے ہیں اور اپنی افادیت کھو بیٹھتے ہیں لیکن پھر بھی اُن میں اتنی جان ہوتی ہے کہ وہ ان نئی پیداواری قوتوں کے جنم لینے اور اُن کی ترقی پذیری میں رکاوٹیں پیدا کریں جو سماجی اور اجتماعی علم کے نتیجے میں بڑھ رہی ہوتی ہیں۔ کچھ عرصے تک یہ کم عمر پیداواری قوتیں اتنی نابالغ اور کمزور ہوتی ہیں کہ ان میں پرانے نظام کو للکارنے اور زیر وبالا کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ AND THEY CANNOT BURST THEIR INTEGUMENT

کچھ عرصے تک زچ قائم رہتا ہے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس درمیانی عرصہ میں معاشرہ

ایک جوہڑ کی طرح جامد ہے۔

عیسوی عہد کی دسویں سے بارھویں صدی تک یورپ کا یہی حال تھا، اور سطحی طور پر جاگیرداری نظام کی جھیل ساکن، خاموش اور جامد نظر آتی تھی۔ لیکن زیر سطح آتش فشانی قوتیں جنم لے رہی تھیں۔ معاشرے کی معروضی ضروریات، سماجی تجربے کو متحرک کر رہی تھیں، اور اجتماعی علم میں، خاموشی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ پھر وہ وقت آیا کہ یہ آتش فشانی قوتیں پھٹ پڑیں اور انھوں نے نئی شکلیں اختیار کیں، جدید سائنسی علوم میں بلوری عمل شروع ہوا اور جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں نے دریاؤں اور سمندروں کو، زمین اور ہواؤں کو مطیع کرنا شروع کیا۔ اجتماعی، سماجی ذہن پھر حرکت میں آیا اور ان جدید پیداواری قوتوں نے اپنے گرد ایک ایسا جدید توانا کلچر تخلیق کیا جو معروضی شرائط سے عین مطابقت رکھتا تھا۔ اور یہ کلچر، وہ ورزش گاہ تھی جس میں ذہن کے پٹھوں کو نئے دور کی للکار کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا گیا۔ جب وہ عظیم ثقافتی انقلاب جسے ہم نشاۃ ثانیہ کا نام دیتے ہیں برپا ہوا، تو انہیں صدیوں میں یورپ کے جاگیرداری نظام کی موت کا وقت افق پر نظر آنے لگا۔

جن طبقات کے ہاتھوں میں اب اقتدار آیا، اُن کی حامی یہی اُبھرتی ہوئی پیداواری قوتیں تھیں۔ گھر کے چھوٹے سے اپنے کارخانے میں ماہر دستکاری اور کھیتوں میں زیادہ موثر اوزاروں کا حامل کسان، دونوں اضافی دولت پیدا کرنے کے عمل میں مصروف ہوئے۔ اور اُس معاشرے کا سب سے اہم رکن وہ تاجر تھا جو نئی دنیاؤں اور نئی منڈیوں کی تلاش میں اُن سمندروں پر جنہیں ابھی ابھی فتح کیا گیا تھا، اور اُن سڑکوں پر جو ابھی ابھی تعمیر کی گئی تھیں، چل پڑا۔ جدید سائنس، اور جدید اور توانا آرٹس ان کے ہتھیار تھے۔ اُن دونوں کے تخلیقی استعمال سے انسان نے قدیم عہد کو بدلنا شروع کیا۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی وضع قطع کے اس مختصر جائزے سے جو تاریخی سبق ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ نئی پیداواری قوتوں کے ارتقاء اور اُس سے ہم آہنگ نئے کلچر کے درمیان ایک جدلیاتی رشتہ ہے۔ اس کے برعکس جب ایک سِن رسیدہ معاشرے پر زوال آتا ہے لیکن اُس کے اندر نئی پیداواری قوتوں کے مکمل ارتقاء میں خارجی اور داخلی معروضی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں، تو پھر پرانا کلچر تخلیقی ذہنی کاوشوں کو دل شکستہ کرتا ہے، اور آرٹس، تخلیقی، میکانکی اور جاں بلب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر اُن میں اتنی زندگی نہیں ہوتی کہ وہ آنے والے دور کے جنون کی ترجمانی کر سکیں اور حالیہ دور میں کوئی جنون بچا ہی نہیں ہوتا جس کی ترجمانی کی جائے۔ روزمرہ کی اصطلاح میں اسے ایک زندہ و تابندہ کلچر نہیں کہا جا سکتا۔

ہمارے برّصغیر میں اُنیسویں صدی کے وسط سے کوئی دو سو سال پہلے تک کے عرصہ میں اگر کوئی زندہ و تابندہ کلچر نظر آتا تھا تو وہ دیہی علاقوں اور گاؤں کا کلچر تھا۔ یہاں کے بے سہارا عوام اپنی مشقتوں کے اور اپنے خوابوں کے گیت گاتے رہے۔ سائنس سے محروم اُن بصیرتوں سے محروم جو صرف سائنس عطا کر سکتی ہے، ابتدائی تعلیم اور سادہ ترین ٹیکنالوجی تک سے محروم، جاگیرداری نظام کے کنکریٹ ڈھانچے میں منجمد، انہوں نے اپنی ذات کے اظہار کا طریق کار تصوّف کے استعاروں کو بنایا، اور یوں کچھ دیہاتی کے گیت ان کے لئے کتھارسس CATHARSIS کا ایک موثر ذریعہ بنے، لیکن اس سے آگے کچھ نہیں۔

برطانوی راج اور اُس کے پڑنے والے اثرات کے باعث اس تصویر کے رنگ بدلنے شروع ہوئے۔ یورپی کلچر کے قوی حملے کے جواب میں، مقابلے میں جاگیردارانہ ہندوستان کے پاس تخیلات کے میدان میں کچھ نہ تھا۔ اور وہ سامراج کی اعلیٰ علم دھات اور جنگ و جدل کی ٹیکنالوجی کے سامنے نہتا تھا۔ جلد ہی دیہی بستیوں کی ثقافتی عمارت ایک بے جان کھنڈر بن کر رہ گئی۔ دیہاتیوں کے گیت نوحے میں تبدیل ہو گئے، اُدھر شہروں میں گزرے زمانے

کی موسیقی اور رقص کی جاندار ہئیتیں، وہ عظیم راگ راگنیاں اور بھارت ناٹیم، اب ہمعصر جذبات کی ترجمانی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ اب اُن کا وجود، قوت سے محروم آرٹ کی ایسی ہئیتوں کا تھا، جن میں کوئی ہمعصر مافیہ CONTENT باقی نہ رہا۔ اور اُن کا معاشرتی کردار بس یہی ہو سکتا تھا کہ بے اثر اور تقلیدی طرزِ ادا اختیار کرتے ہوئے، ماضی کے عظیم کارناموں کے گن گائیں۔ ہندوستان کے کلچر کا یہ ایک تبدیلی کا عہد تھا۔

ان صدیوں کے دوران تھیٹر بے جان پڑا رہا تھا۔ یوں بھی انسانی جسم کی نقالی کے بارے میں مسلم اتیھوس کا رویہ متعصبانہ تھا۔ اور مسلمان، تھیٹر کو ایک کافرانہ فعل قرار دیتے تھے اُن کی اس عداوت میں اس امر سے اضافہ ہی ہوا ہو گا کہ جاگیردارانہ صدیوں کے دوران ہندو تھیٹر کے کردار اُن کی دیویوں دیوتاؤں سے اخذ کئے گئے تھے۔ لیکن ہندوؤں کا تھیٹر، یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے زمانے کے NATIVETY ولایت کے چرچ کے تھیٹر سے مکمل طور پر مشابہ نہیں تھا۔ اُس کی ہئیت یقیناً مذہبی استعارے کی تھی، لیکن اس کا مافیہ وفاداری کے ساتھ جاگیردارانہ کلچر سے جڑا رہا۔ اُنیسویں صدی کے آغاز کے وقت یہ مافیہ بھی غیر متعلقہ ہونے کے باعث مرجھا چکا تھا۔ بس انوکھی وضع وصورت اور بے سرو پا ادائیں باقی رہ گئی تھیں، ہندوستانی معاشرہ جن کے حقیقی معنوں کو گزرے زمانے کی دھند میں کہیں کھو چکا تھا۔

جاگیرداری عہد کا آرٹ مر چکا تھا۔ ایک ایسے آرٹ کے وجود میں آنے کے لئے جو نئے تقاضوں سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو، ابھی وقت درکار تھا۔ وہ وقت بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ آیا، جو داخلی اور خارجی جبر و استبداد اور استحصال کے خلاف ایک احتجاجی عہد کی شکل میں طلوع ہوا۔ ہندوستان اپنی طویل جاگیردارانہ نیند کے بعد بالآخر بیدار ہونے لگا تھا۔

اُس وقت ہندوستان کی دیہی بستیوں کے مقابلے میں شہروں کی امتیازی صفت -

صرف یہ تھی کہ وہ تجارت کے مراکز رہے تھے یا پھر برسرِ اقتدار اشرافیہ کا مقامِ نشست تھے اب جگہ جگہ ان شہروں نے صنعتی سرگرمیوں میں دلچسپی لینی شروع کی۔ ایک شہری پرولتاریہ نمودار ہونے لگے۔ ہندوستان کی زبانوں کی جاگیردارانہ لغت میں چپکے چپکے نئے الفاظ داخل ہونا شروع ہوئے کیونکہ اب وقت کا تقاضہ یہ تھا کہ زمانے کے بدلتے ہوئے تشخص اور آرزوؤں کی زیادہ صحیح ترجمانی کی جائے۔ یوں لگتا تھا کہ بس اب وقت آ گیا ہے کہ اس سب کے ساتھ ساتھ موسیقار سے نئی آوازیں سننے میں آئیں، رقص کی نئی قسمیں جنم لیں، اور تھیٹر کے اسٹیج پر توانا اور حسبِ زمانہ کردار قدم جمائیں، اور یہ سب اپنی اپنی جگہ زندگی کے تقاضوں کی حقیقی نمائندگی کریں۔

لیکن پیچیدگیاں بھی تھیں۔ سائنس اور صنعت، ہندوستان کے جاگیردارانہ عہد کی فطری بوسیدگی کے اندر موجود جڑوں سے نہیں ابھری تھی؛ بلکہ انہیں ایک پرائی سامراجی طاقت نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جبراً یورپ سے ہندوستان منتقل کیا تھا۔ اور ہندوستان میں وہ معصومیت کے انداز میں نہیں بلکہ ایک جامع حاکم کلچر کے اجزا بن کر وارد ہوئے۔ اور اس قدیم اور مغرور تہذیب کے مقدس دریاؤں کو ناپاک کرنے کے لئے اپنے ہمراہ ایک غیر اور غیر مقبول زبان بھی لائی۔ ہندوستان کے خود پسند شاعر سے یہ سب ہضم نہ ہو سکا۔ وہ چلایا ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اس مایوس کن فضا میں عبدالرحمان چغتائی جیسا عظیم فنکار بھی معروضی اور اساسی اعتبار سے ترقی اور تبدیلی کی علامتوں کو نہ پہچان سکا۔ اُس نے ان سب سے پیٹھ موڑ لی اور اپنی تخلیقی قابلیت کو اُس متروک مُغل کلچر کی یاد تازہ کرنے میں صرف کر دیا جس میں دوبارہ جان ڈالنا ممکن نہ تھا۔ اور آغا حشر ایسے کھیل لکھنے لگے جو ہیئت اور موضوع دونوں کے

اعتبار سے ہم عصر انجھوں سے صدیوں دور تھے، چنانچہ ابتدا ہی سے مردہ۔

یوں اچانک اور جبراً ہندوستان کا جو ایک ایسے کلچر سے سامنا ہوا جس نے سائنس کی گود میں جنم لیا تھا، اُس کا پہلا اور بے ساختہ ردِّعمل اس کے مجروح تکبّر اور یادِ گزشتہ کی مخلوط شکل میں سامنے آیا، لیکن مستقبل کی للکار سے دوچار ہونے پر ماضی کیطرف فرار، اُس للکار کا جواب نہیں تھا۔

پھر وہ وقت آیا کہ برطانیہ سے سیاسی اقتدار چھین لیا گیا اور ہندوستان میں براہِ راست نوآبادیاتی راج کا خاتمہ ہو گیا، اور برصغیر بالآخر آمادہ ہوا کہ اپنی انا کے ساتھ استدلالی اور منطقی روّیہ اختیار کرے اور پھر سائنس کا عہد اپنی صحیح شکل میں نظر آنے لگا۔ اور پھر یہاں کے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ سائنس کسی بداخلاق مغربی تہذیب کی شیطانی ایجاد نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کی اجارہ داری۔ بلکہ یہ تمام بنی نوعِ انسان کا مشترک ورثہ، ملکیت اور حق ہے۔ اس نئے روشن خیال رجحان میں رہنمائی پاکستان سے نہیں بلکہ ہندوستان سے آئی کیونکہ وہاں ابھرتے ہوئے صنعتی مراکز، متوسط طبقے اور پرولتاریہ کے ارتکاز کا عمل دخل شروع ہوا۔

* * *

کلچرل کی بالیدگی کی نوعیت اور رفتار کا تعین پیداواری رشتے کرتے ہیں، لیکن تبدیلی کے دور میں پیداواری رشتوں کی ایک سے زیادہ قسمیں کچھ عرصہ کے لئے ساتھ ساتھ چلتی ہیں، ایک دوسرے کے خلاف بالادستی کے حصول میں کوشاں۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں یہ جنگ مختصر اور کافی حد تک فیصلہ کُن رہی، اور وہاں کی مقامی بورژوازی ایک ایسی غالب طاقت بن کر اُبھری جو اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی تھی کہ جاگیردارانہ قوتوں کے بچے کھچے سیاسی نام ونشان کو نقشے سے مٹا دے۔ اور اُس میں اتنی توانائی بھی تھی کہ ہندوستان کی اُبھرتی ہوئی معیشت پر جدید نوآبادیاتی قوتوں کی گرفت مضبوط نہ ہونے دے۔ اس بورژوازی کی

بالیدگی کے ساتھ ساتھ ایک بڑھتی ہوئی پرولتاریہ اور ایک متوسط طبقے نے بھی جنم لیا اور اس متوسط طبقے کے اندر چند متضاد عناصر شامل تھے، جو تاجر، پیشہ ور، تنخواہ پانے والے اور تعلیم یافتہ بیروزگار لوگوں پر مشتمل تھے۔ یوں کہیئے کہ طبقاتی جنگ کی نئی قطاروں نے اپنی اپنی جگہیں متعین کر لی تھیں۔

یوں کلچر ایک تخریبی دور میں داخل ہوا۔ پوری دنیا میں اور خود ہندوستان میں بھی دو عظیم عالمی نظام، سرمایہ داری اور سوشلزم، ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف تھے۔ اس جنگ میں ادیب، مصوّر، گلوکار، رقّاص اور اسٹیج اور فلم کے پیش کار نے اپنے اپنے دوست اور دشمن کو پہچانا اور کسی ایک قطار میں جا کھڑے ہوئے۔ پچھلے چالیس سال میں ان کے درمیان بڑھتی ہوئی قطبیت نے جو شکلیں اختیار کیں، اُن سے حقیقی صورتِ حال کو پہچاننے میں بہت سے مفید اشارے ملتے ہیں۔

ہندوستان کی قدیم روایت میں موسیقی اور رقص کو ایک اعلیٰ مقام میسّر رہا ہے، حالانکہ ان کا نامیاتی ارتقاء صدیوں پہلے رُک چکا تھا، اُنہیں قدیم زمانے کے تبرّک یا نشانی کے طور پر مصنوعی حربوں کے ذریعے زندہ رکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان کی موسیقی اور رقص کا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی سب سے شاندار میراث انہی کی ہے۔ وہاں کے موسیقار اور رقّاص کلاسیکی روایت میں کئی سال کی تربیت کے دوران تیار کئے جاتے ہیں، چنانچہ ان قدیم روایات کی بقاء میں اُن کا بڑا گہرا VESTED INTEREST ہے۔ مزید برآں یہ کہ مغربی تہذیب کے غالب طبقے ہندوستانی موسیقی اور رقص پر فدا ہونے کے انداز میں ان کی خوبیوں کے بارے میں اساطیری اور فلسفیانہ تبصرے شائع کرتے ہیں، اور میڈیا کے ذریعے انہیں ہر طرح سے سراہنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موسیقی اور رقص کی روایتی ہیئتوں کے ذریعے ہندوستان کے عوام کو اُن کے جاگیردارانہ کلچر کی نیند میں مدہوش رکھا جا سکتا ہے اور یہ بھی کہ انہیں ترقی فکر کی وباؤں سے محفوظ رکھنے

کا یہ بہترین طریقہ ہے ۔ چنانچہ ہندوستان کے موسیقاروں اور رقاصوں نے اپنی وفاداریوں کو قدامت پسند قوتوں سے جوڑے رکھا ہے ، اور اس کے عوض اُنہیں مقامی اور غیر ملکی امراء کی فراخدلانہ سرپرستی میسّر رہی ہے ۔

ہر ملک میں ادیب اور مصوّر آرٹ کی دنیا میں غریب رشتہ دار کی حیثیت رکھتے ہیں اور یوں وہ بالعموم ترقی پسند قوتوں کے حلیف ہوتے ہیں ۔ یہی صورتحال ہندوستان میں ہے ، حالانکہ یہ دلیل قدرے مشروط ہے اور اس کا تفصیلی جائزہ اس مقالے میں پاکستانی حوالے سے لیا جائے گا ۔

تھیٹر کے تقاضے زیادہ پیچیدہ ہیں ۔ ان کا تعیّن سب سے پہلے ڈرامہ نگار کرتا ہے ۔ پھر اُس کی روشنی میں ہدایت کار اور اداکار کھیل کو اسٹیج پر منتقل کرتے ہیں ۔ اور اس عمل کے دوران اُنہیں بہت سے وسائل درکار ہوتے ہیں جن سب پر روپیہ لگتا ہے ۔ معاشرے میں ڈرامہ نگار کی مخصوص سطح کی وجہ سے اُس میں بھی دیگر لکھنے والوں کی طرح ترقی پسند رجحانات پائے جاتے ہیں ۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سماجی ضمیر اُن لوگوں کے ہاتھ بیچ دیتا ہے جو اُس کے کام میں پیسہ لگانے کے لئے تیار ہوتے ہیں ، یا پھر سنسر شپ کی دھمکی کے ذریعے اُس کے وجود کو ختم کر سکتے ہیں ۔

لیکن خود ہندوستانی معاشرے میں متضاد عناصر موجود ہیں ، جن میں ماضی کیساتھ جذباتی رشتے ، ہم عصر حقائق ، اور ابھرتے ہوئے رجحانات شامل ہیں ، اور یہ تخریبی صورتحال حکومت سمیت معاشرے کے تمام اداروں میں بھی پائی جاتی ہے ، چنانچہ ان اداروں سے ، تھیٹر کے اُن کارکنوں کو جو اپنے آرٹ کو ترقی پسندانہ مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں ، کسی حد تک مدد ملتی ہے ۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ ادارے خوب سمجھتے ہیں کہ عوام بر محل یعنی ترقی پسند تھیٹر کے قدردان ہیں اور اُسے دیکھنے کے لئے پیسہ صرف کرتے ہیں ۔ بہر حال اس مالی ماتحتی کے رشتہ کی وجہ سے ہندوستانی تھیٹر ، اپنے ترقی پسند اجزاء سمیت اپنے جوہر میں اصلاحی اور

اور پاپولسٹ POPULIST زیادہ ہے اور انقلابی کم۔ یہ انقلابی کردار ان چھوٹے چھوٹے گروہوں نے اپنایا ہے جو اپنے سماجی شعور سے فیضان حاصل کرتے ہوئے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کام کرتے ہیں، نہ کہ منافع کمانے کے لئے۔ اور اپنے تنقیدی اور سائنسی رویوں پر مبنی تھیٹر کو وہاں لے جاتے ہیں جہاں عوام بستے ہیں۔ ان گروہوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو کہ موجودہ عہد کی بڑھتی ہوئی پیداواری قوتوں کا تاریخی تقاضہ ہے۔

ہندوستان کے سینما کا تجربہ اس بات پر سب سے زیادہ روشنی ڈالتا ہے کہ وہ طبقے جو حکومت کرتے ہیں، اور وہ طبقے جو حکومت کرنے کے خواہش مند ہیں، کلچر کی بلند ترین چوٹیوں پر قبضہ جمانے کو کیوں اور کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

سینما اپنا وجود صرف یوں قائم رکھ سکتا ہے کہ وہ عوام کے وسیع ترین حلقوں کیلئے ذریعہ تفریح ہے۔ اور اس کی وجہ اقتصادی ہے پہلی بات یہ ہے کہ کسی کہانی کو فلم پر منتقل کرنے میں بھاری رقم صرف ہوتی ہے۔ دوسرے، جب وہ فلم ان گنت سینما گھروں، شہروں ملکوں اور وقت کا سفر کرتی ہے، اور لاتعداد لوگ اسے دیکھنے جاتے ہیں تو ایک اور زیادہ بھاری رقم، سیلاب کی طرح بہتی ہوئی واپس لوٹتی ہے۔ آخر بلا وجہ تو نہیں کہ یہ فلم کا پیشہ صنعت کہلاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ منڈیوں اور منافع کی تلاش میں شاندار سرمایہ دارانہ روایت کے مطابق فلم ساز اور فلم ساز ممالک، جب ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ میں شریک ہوتے ہیں تو اُن کی یہ مجبوری بن جاتی ہے کہ بتدریج بڑی فلمیں بنائیں۔ اور اس پیشے میں کسی فلم کا زیادہ "بڑا" ہونا بہتر ہونا سمجھا جاتا ہے۔ اور آخری بات یہ کہ کاروباری فلم سازی کی کچھ اندرونی حرکیات ہیں، جن کا تعین ایک طبقاتی نظام میں عوام کے اجتماعی نفسیاتی تقاضوں سے ہوتا ہے۔ اور ان اندرونی حرکیات کے زیر اثر، کاروباری فلم سازی ایک ایسی ٹیکنالوجی ہے جو کبھی ساکت نہیں رہ سکتی۔ یہ ہر ایک کا عام تجربہ ہے کہ کوئی فلم باکس آفس پر ہٹ ہو جاتی ہے تو اس کے کامیاب فارمولے پر چربہ فلموں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر

بہت جلد تماشائی اُس فارمولے سے اُکتا جاتے ہیں اور بیچارہ فلم ساز کسی نئے فارمولے کی تلاش میں مضطرب ہو جاتا ہے۔ تماشائی کو ہر وقت "زیادہ" کی طلب رہتی ہے اور فلمی صنعت کی مستقل کاوشیں "زیادہ" کی تلاش میں لگی رہتی ہیں۔ سالہا سال فلم ساز کی یہی کوشش رہتی ہے کہ اُس کی فلموں میں زیادہ رنگ ہو، زیادہ گلیمر ہو، زیادہ تیکنیکی اختراعات ہوں، زیادہ سیکس ہو۔ ان میں زیادہ دہشت ناکی ہو، زیادہ واہمہ ہو۔ اور ظاہر ہے ایسے عجوبہ کی تلاش میں زیادہ روپیہ صرف ہوتا ہے اور اُس سے زیادہ روپیہ واپس آتا ہے۔

سب سے پہلے ہالی وڈ کے کاروباریوں نے راستہ دکھایا، اور بمبئی کے کاروباری پورے جوش کے ساتھ اُن کے پیچھے لگ گئے۔

بورژوا معاشرے میں حاکم طبقے کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے کلچر کو عوام پر مسلّط کرے اور یوں اپنے اقتدار کو قائم رکھے۔ ہندوستانی بورژوا طبقے کا وجود میں آنا، صرف چند دہائیوں کی بات ہے اور اُس کا اقتدار ابھی مکمل طور پر مستحکم نہیں ہوا۔ چنانچہ اُس کا فوری مقصد یہ ہے کہ جاگیردارانہ عہد کے اُن رشتوں کو کمزور کیا جائے اور پھر توڑا پھوڑا جائے، جو قبیلے، نسل، مذہب اور زبان پر انحصار رکھتے ہیں، تاکہ سماجی سکوت کا خاتمہ ہو اور اُس کی جگہ سماجی حرکت پذیری عمل میں آئے۔ ان مقاصد کے حصول میں سینما، بورژوا طبقے کے ہاتھوں میں کلچر کا بنا بنایا ایک آلۂ کار ہے۔

جب غریب عوام سینما گھر میں واہمانہ انداز میں بڑے بڑے سورماؤں، جانبازوں، عاشقوں اور امراء کے ساتھ اُن کی فتوحات میں شریک ہو جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ مل کر حسیناؤں کے دل چھین لاتے ہیں، تو یقیناً کچھ عرصہ کے لئے خود اپنی اُکتا دینے والی اور مشقت بھری زندگی کو برداشت کرنا قدرے آسان ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے اُن کی قوتِ برداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ویسے ویسے اُن کی انقلابی امکانی قوت اُن میں سے نچوڑ لیجاتی ہے۔ حاکم طبقے کے ہاتھ میں اس افیون سے زیادہ مؤثر آلۂ کار اور کیا ہو سکتا ہے۔

چنانچہ ہندوستان میں سینما کو اُس کے ابتدائی دور ہی سے بگ بزنس نے اپنالیا، اور اپنے کاروباری اور MASS پروڈکشن کے روپ میں اُسوقت سے اب تک اُنہی کے ہاتھوں میں رہا ہے۔ کچھ دانشور خود انقلاب اور سماجی اصلاح کے بارے میں رومانوی سوچ کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسے نقادوں کا ہندوستانی فلم سازوں پر یہ الزام ہے کہ ان کا ہندوستان کی حقیقی زندگی سے فاصلہ بڑھتا جارہا ہے۔ اور ان کی فلموں میں واہمہ کا عمل دخل اور زیادہ بڑھتا چلا جارہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے فلمساز اور اُن کے سرمایہ دار حلیف اس الزام کے سامنے نادم نہیں ہیں، بلکہ وہ ڈینگیں مار کر کہتے ہیں کہ یہی تو اُن کا مقصد تھا۔ اور یہی ہے اُن کی کامیابی کا ثبوت!۔

لیکن سینما اتنا موثر میڈیم ہے کہ اسے بلا شرکتِ غیرے، بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ہندوستان کے کثیر النوع معاشرے کو مدِ نظر رکھتے اور اس حقیقت سے پورا استفادہ کرتے ہوئے کہ وہاں کی جمہوری قدروں کے تحت حزبِ اختلاف کے ترقی پسند گروہوں کو بھی اجازت ہے کہ وہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکتے ہیں تو بیشک پہنچائیں، چند ترقی پسند فلم سازوں نے کم لاگت والی ایسی فلمیں بنانا شروع کی ہیں جو نیند کی گولیاں نہیں ہیں بلکہ اُن کا مقصد فکر و عمل کو حرکت میں لانا ہے۔ ان فلموں کی باکس آفس پر کامیابی کروڑوں میں تو کبھی نہیں ناپی جائے گی، لیکن ان کا اثر یقینی ہے اور یہ کلچر کے میدان میں اُس حکمتِ عملی کا اہم جزو ہیں جس کا مقصد کچلے ہوئے اور استحصال کے شکار عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنا ہے۔

* * *

تو پھر پاکستان میں صورتحال کیا ہے؟

جس وقت برطانیہ کے ہاتھوں سے سیاسی اقتدار چھین لیا گیا، اور برصغیر میں نوآبادیاتی نظام کا براہِ راست راج ختم ہوا، تو سائنسی عہد اور سائنس کے ہماری زندگی میں برمحل ہونے

کے بارے میں پاکستانی معاشرے میں جو ادراک پایا گیا وہ ہندوستان سے بالکل مختلف تھا اور اس بات کا پاکستانی کلچر کے ارتقاء کے انداز پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

سائنس کے بارے میں عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ فطرت کے طبعی قوانین کو جاننے اور اُن پر عبور حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہمیت کی حامل یہ دلیل ہے کہ سائنس انسان کو ایک مخصوص طرزِ فکر، ایک سائنسی رویّہ عطا کرتی ہے اور یہ سائنسی رویّہ اختیار کرتے ہوئے انسان اپنے سماجی اور تاریخی تجربے کا استدلالی جائزہ لینے کا اہل ہو جاتا ہے۔ سائنسی رویّہ کائنات اور عالمِ انسانی کے ادراک کا وہ طرزِ فکر ہے جو صرف اُن واقعات کو خاطر میں لاتا ہے جن کی توثیق ممکن ہو، اور اُن تمام دلائل کو رد کرتا ہے جو مابعد الطبیعاتی طرزِ فکر کی تخلیق ہوں چنانچہ صرف سائنسی رویّہ وہ طریقِ کار ہے جن کے تحت انسانی معاشروں میں مدّوجزر ہوتا ہے۔

تاریخ کے مختلف معاشروں میں سائنسی رویّے کی بیداری کی سطح کی، اُن کے اندر کی پیداواری قوتوں اور پیداواری رشتوں کی ارتقائی سطح سے بہت صحیح مطابقت رہی ہے۔ تاریخ میں اس کی بہت دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔

اندراجی تاریخ میں سائنسی رویّے سب سے پہلے ساتویں اور چھٹی صدی قبل از مسیح کے اُن یونانیوں میں نمودار ہوئے، جن کا سیاسی طرزِ زندگی جمہوری اور شہری تھا۔ یہ لوگ اُس زمانے میں بہت کم اضافی دولت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن اُن کا مشرقِ وسطیٰ اور مصر کی لبِ دریا درخشاں تہذیبوں سے تعلق قائم ہو جانے کے باعث اُن میں دولت کی بھوک پیدا ہو چکی تھی۔ اُن کی اپنی زمین میں پانی کی کمی تھی۔ انہیں زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ ٹیکنالوجی کی اختراعات کی بہت مانگ تھی۔ اس وقت تک نہ غلام تھے، نہ مزارعے۔ سماجی طبقات کی ترتیب، دھندلی اور غیر مستقل تھی۔

ان حالات میں، جب وہاں نہ کوئی اُمراء کا باقاعدہ طبقہ تھا، نہ کوئی ایسے مخصوص مفادات اور اجارے جن کا تحفظ کرنا ضروری ہو، وہاں مابعد الطبیعاتی

تفکر کی نہ کوئی سماجی ضرورت تھی نہ مجبوری چنانچہ تھیلز THALES ایک مادیت پسند فلسفی تھا جس نے کائنات کے مصدر پر غور کرتے ہوئے اپنی تھیوری میں خالق کی موجودگی کو فرض کرنا ضروری سمجھا۔ بالکل فرانس کے ریاضی دان لاپلاس LAPLACE کی طرح لیکن اُس سے کوئی چوبیس صدیاں پہلے۔ اور تغیر کے فلسفی ہیراقلیطس نے اپنی دلیل یوں پیش کی۔ ”تمام اشیاء آگ کا بدل ہیں اور آگ تمام اشیاء کا بدل۔ بالکل اُسی طرح جیسے اشیاء سونے کا بدل ہیں اور سونا اشیاء کا۔“ جے ڈی برنل نے اس بات کی نشاندھی کی ہے کہ یہاں قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اُس زمانے کے تیکنیکی اور اقتصادی سلسلہ ہائے عمل کے اندر سے اُن یونانیوں کا نیا فلسفہ جنم لے رہا تھا۔ اور تاریخ کا سب سے پہلا جدلیاتی مفکر بھی شاید ہیراقلیطس ہی تھا۔ اُس نے دعویٰ اور ضد دعویٰ کا تصوّر پیش کیا اور بتایا کہ اُن دونوں کا ایک دوسرے پر لازمی انحصار ہے۔ اُس نے کمان اور اس کی ڈور کی مثال دی جن کے تناؤ کے نتیجے میں تیر چلایا جاتا ہے۔

اور پھر وہ وقت آیا جب یونانی معاشرے نے اپنی شکل بدلی اور دو واضح طبقے وجود میں آئے۔ وہ جو غلاموں اور دولت کے مالک بنے تھے، اور وہ جو دولت پیدا کرتے تھے۔ پھر یہ ضروری سمجھا گیا کہ کوئی ایسا فلسفہ مرتب کیا جائے جو اشرافیہ یعنی بہترین لوگوں کے مفاد اور اجاروں کو جائز بھی قرار دے اور نچلے طبقوں کو دولت کی اس نئی تقسیم کو قبول کرنے پر آمادہ بھی کرے۔ اس نئے اور باقاعدہ طبقاتی نظام میں افلاطون پہلا اور سب سے بڑا مفکر تھا جس نے فطرت اور معاشرے کے مطالعے میں عینیت اور مابعد الطبیعات کا استعمال شروع کیا۔ اُس نے دو سو سال پہلے کے یونانی مفکرین کی مادیت کو فلسفیانہ بکواس قرار دے کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا، اور اپنی تحریروں میں طبقاتی نظام کو نہ صرف فطری بلکہ مقدس ثابت کرنے کی کوشش کی۔ افلاطون نے علیتی دنیا پر غور کرتے ہوئے اقتدارِ مطلق کا تصور آگے بڑھایا، اور دعویٰ کیا کہ یہ علیتی اقدار اس تمام مسلم

سے بالاتر ھیں جو محض انسانی حواس یعنی تجربیت کے ذریعے حاصل کیا جاتے۔

اُس کے بعد ارسطو نے اپنا مشہور نظریۂ اوسط پیش کیا۔ نہ بہت زیادہ نہ بالکل ہی کم اور اس نظریے کی مدد سے اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ معاشرے میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے بشرطیکہ تمام لوگ اپنے سماجی رشتوں میں میانہ روی اختیار کریں۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ افلاطون اور ارسطو کی آج تک کیوں پوجا کیجاتی ہے۔ اور اُمراء کے مفادات کے دفاع کیلئے کیوں آج بھی اُنہی کی خدمات حاصل کیجاتی ہیں۔

یوں سائنسی طرزِ فکر کی یونانی شعل جو مہذب انسان کی تاریخ میں اتنے قدیم زمانے میں روشن کی گئی تھی، بس چند دن روشنی دے پائی، اور پھر امراء اسے گل کر دینے پر مجبور ہو گئے کیونکہ اُس کی روشنی کچھ زیادہ ہی شوخ تھی۔

پھر رومن ایمپائر ROMAN EMPIRE اور عیسائیت کی ابتدائی صدیوں میں تمام علم خواہ وہ مادیتی ہو یا عینیتی، ایک طرف پھینک دیا گیا کیونکہ اُس کی کوئی عملی افادیت نہ تھی۔ اور یوں کچھ دیر بعد لوگ اسے بھول گئے۔ روم میں غلاموں پر مبنی ایک پلوٹوکریسی PLUTOCRACY تھی، یعنی وہاں سیدھا سیدھا دولت مندوں کا راج تھا۔ وہاں کے موارثِ اعلیٰ کی پوری توجہ دولت سمیٹنے اور دولت صرف کرنے میں لگی رہی اور اس عمل میں اُن کے لئے وہ ٹیکنالوجی جو پہلے سے چلی آرہی تھی بہت کافی تھی۔ رومن ایمپائر کی تمام شان وشوکت کے باوجود روم کی تہذیب نے انسانیت کے لئے کوئی لافانی افکار ورثے میں نہیں چھوڑے۔ سوائے اپنے عظیم رومی قانون کے جسے بہت باریکیوں میں جاکر تدوین کیا گیا تھا اور جس کا تعلق نجی ملکیت کی حفاظت، لقاء اور وراثت سے تھا اس قانون کو چند صدیوں بعد یورژوا یورپ نے فینائل کی کوٹھیوں سے نکالا اور اس سے خوب استفادہ کیا اور اب بھی کر رہا ہے۔

جب روم کی شہنشاہی مملکت کی ارتکازی طاقت بکھرنے لگی تو یورپ کے باشندوں

نے دیکھا کہ اب وہ اپنے قبائلی عہد کی تشکیل سے آگے دھکیلے جا چکے تھے اور ایک باقاعدہ جاگیردارانہ معاشرے میں پہنچ چکے تھے، جو وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ بکھرا ہوا اور بے ربط بھی تھا۔ سائنسی رویّوں کے بیج جو قدیم یونانیوں نے مہذب انسان کی ابتدائی صدیوں میں بوئے تھے اب جاگیردارانہ نظام کی مٹی کی گہرائیوں میں دفن تھے، کھاد اور پانی سے محروم جاگیردارانہ نظام میں تخیلات اُتنے ہی بے کار نظر آتے تھے جتنے کہ زرِمبادلہ اور زرِ۔ اور یوں ان گنت خودمختار بستیوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی میں تہذیب کی بالکل ابتدائی سطح پر چند صدیاں گزار دیں۔

لیکن اُدھر مشرقِ وسطیٰ کے عرب ایک نئی بصیرت سے تازہ دم ہو کر اپنی قبائلی حدود سے باہر نکل آئے تھے۔ اُن کی ابتدائی مہمات یورپ کے خلاف تھیں، جو رومن اسراف کے نتیجے میں تھک کر چور پڑا تھا۔ اور پھر اُنھوں نے اپنی توجہ بازنطین BYZANTINE پر مرکوز کی، جس کی اُس وقت اپنی مہم بس یہ تھی کہ وہاں کے عام لوگ عیسائیت کی مذہبی رسوم پر باقاعدگی سے عمل کریں۔ مشرق میں عربوں کا مقابلہ ہندوستان سے ہوا، جس کے ذات پات کے نظام میں ایسے متعدد سماجی گروہ موجود تھے جو عقلیت پر مبنی اصلاحات کے لئے معروضی طور پر تیار تھے۔

عربوں کی یہ ابتدائی مہمیں غیر متوقع اور ڈرامائی طور پر کامیاب رہیں۔ تاریخی حوالے سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان فتوحات کے نتیجے میں عربوں کا تعارف ان قدیم تہذیبوں سے ہوا، جو اُن کی اپنی تہذیب سے اپنے زمانے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھیں، یعنی مغرب میں یونان اور مشرق میں ہندوستان۔ اپنی جگہ پر عرب معاشرہ خود جوان اور توانا تھا اور اپنی اُس سلطنت کو مستحکم کرنے کا خواہاں تھا جسے اُس نے کچھ زیادہ ہی آسانی سے فتح کر لیا تھا۔ چنانچہ اُنہیں تخیلات، سائنس اور سائنسی رویّوں کی شدید سماجی ضرورت تھی، اور انہوں نے سائنس پر باقاعدہ چھاپا مارا، اور اس بات سے ان کے ضمیر کو کوئی دھکا

نہیں لگا کہ اُن کی اپنی بشارت میں اُن کا دین انسانیت پر نازل ہوا تھا اور اُن کی زندگی کا دار و مدار ایمان پر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کا تقاضا یہ تھا کہ مومن اپنے زمانے کا سب سے بڑا عقلیتی سائنسدان بن جائے گا لیکن صرف کچھ عرصے تک۔

وہ وقت بھی گزر گیا، اور عرب معاشرہ تاریخ کی اگلی سطح پر ارتقا نہ کر سکا۔ شمالی افریقہ، ترکی، ایران، وسطی ایشیا، اور شمالی ہندوستان میں اُن کی وارث سلطنتیں ایک بار پھر جاگیردارانہ یا پھر قبائلی پیداواری رشتوں کی تشکیل میں واپس لوٹ گئیں۔ یورپ کے قرونِ وسطیٰ کی طرح یہاں کے جاگیردارانہ نظام کو بھی سائنسی رویوں کے استعمال کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔

لیکن گیارہویں صدی کے لگ بھگ (جیسا کہ اس مقالے میں پہلے بھی ذکر آیا ہے) یورپ متحرک ہونا شروع ہو گیا تھا۔ متعدد معروضی اثرات کے نتیجے میں جاگیردارانہ نظام کے رحم میں نئی پیداواری قوتوں نے جنم لینا شروع کیا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی کے دوران اُن چھوٹے اور بڑے شہروں میں جو ہر جگہ وجود میں آ رہے تھے، پیدائشی اشرافیہ کے مقام کو دولت کی اشرافیہ نے چھین لیا، اور آج کی طرح اُس وقت بھی دولت کو سمیٹنے کا انحصار اضافی پیداوار پر تھا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ سال ہا سال نئی اور بہتر اشیاء کی پیداوار پر۔ بتدریج بہتر اشیاء بنانے کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ٹیکنالوجی میں بھی بتدریج ترقی ہوتی رہے، اور ٹیکنالوجی کو سائنس اور سائنسی رویوں سے غذائیت ملتی ہے۔

دولت پیدا کرنے کے لئے آزادی کی فضا بھی درکار ہے، آزادیٔ فکر، آزادیٔ حرکت و عمل اور ایسے قوانین و روایات سے آزادی جنکی افادیت ختم ہو چکی ہے لیکن چونکہ آزادی جاگیردارانہ نظام کی جانی دشمن ہے، اور چونکہ یورپ میں آزادی اُس دور کا تقاضا بن چکی تھی، اس لئے جاگیردارانہ نظام کو میدان چھوڑ کر جانا پڑا۔

سائنسی رویوں اور معاشرے کے ارتقاء کے درمیان تاریخی اور جدلیاتی رشتوں

کا یہ مختصر جائزہ لینے کے بعد جب ہم پاکستان میں کلچر کی نشوونما اور سماجی و اقتصادی واقعات کا باہمی رشتہ تلاش کرتے ہیں۔ تو اس کام میں ہم ایک ضروری تناظر اختیار کر سکتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں اُن چار صوبوں میں جو آج کے پاکستان میں شامل ہیں کیفیتی اعتبار سے معاشرے پر جو سماجی و اقتصادی نظام غالب تھا، وہ جاگیردارانہ نظام تھا اور یہ صورتحال برطانوی راج کی حکمت عملی کا ارادی نتیجہ تھی۔ پنجاب، سندھ، اور صوبہ سرحد کے زرعی علاقوں میں سماجی اور سیاسی رویئے، سماجی نقل و حرکت، دوستیاں اور دشمنیاں، شادیوں اور وراثت کے قوانین، اور پیشہ اختیار کرنے کے فیصلے، ان سب کا تعین جاگیردارانہ رسوم و روایات کے مطابق کیا جاتا تھا۔

صنعت کاری اور سرمایہ داری کو فروغ دینے کے سلسلے میں ابتدائی حکومتوں نے کچھ مناسب پالیسیاں ضرور اختیار کیں، اور ان کے نتیجے میں معاشرے میں سرمایہ دارانہ طرزِ عمل کی سمت میں رجحانات کا آغاز بھی ہوا لیکن یہ کہ اس شہری اور صنعتی تجربے کے اثرات سماجی شعور میں اس حد تک جذب ہو جائیں، کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جاگیردارانہ نظام کو اُسکے ثقافتی اور ذہنی سکوت کی کیفیت سے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا جاتے۔ اس سب کے لئے ابھی وقت درکار تھا۔

بہرحال جاگیردارانہ نظام کی یہ ہم عصر شکل جاگیردارانہ ضرور تھی لیکن ایک فرق کے ساتھ اور یہ فرق بیسویں صدی کے وسط کی تاریخی فضا تھی جس میں پاکستانی معاشرہ ایک جزیرے کی طرح پڑا تھا۔ جس کے جاگیردارانہ سکون کو چاروں طرف سے مدوجزر کی لہریں اور طوفان مضطرب کر رہے تھے۔ یہ فضا انتہائی ذہنی سرگرمیوں کی اور ٹیکنالوجی کی شاندار فتوحات کی فضا تھی۔ یہ ایک ایسی فضا تھی جس میں سائنس کو مسترد کر دینے کا مطلب یہ بنتا تھا کہ قومی بقا کے مواقع کو بھی مسترد کر دیا گیا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ یہ ایک ایسی فضا تھی جس میں دو بڑے عالمی نظام بالمقابل کھڑے تھے: یعنی سرمایہ داری اور سوشلسٹ نظام

اور یہ دونوں نظام تبدّل پذیر معاشروں پر اپنا تاریخی دباؤ ڈال رہے تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام اس غرض سے کہ تاریخ کو اپنے موجودہ ڈھانچے میں محفوظ رکھا جائے، اور سوشلزم تاریخ کے دھارے کو بدلنے کی غرض سے۔

اپنا اپنا انتخاب کرنے کا وقت آگیا تھا اور ظاہر ہے کہ پاکستان کے جاگیرداری حکمرانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اُس عالمی نظام کے ساتھ، بلکہ اس کے تابع، اپنا رشتہ جوڑیں جو تبدیلی کا مخالف تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے معروضی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اپنے اقتدار کی بنیادوں کو قدرے وسیع کریں۔ وہ اس اندیشے سے بھی دوچار تھے کہ بنیادی جمہوری تبدیلی حاصل کرنے کی غرض سے شہروں اور دیہاتوں کے محنت کش عوام عنقریب اور لازماً اپنی جدوجہد میں شدت پیدا کریں گے۔ یہ نہ صرف جاگیردارانہ طبقے بلکہ ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کے لیے بھی ایک مشترک خطرہ بن کر سامنے آیا چنانچہ ان دونوں نے اقتدار کے قلعے میں اپنی جگہ بنالی، اور قلعے کو زیادہ مستحکم کرنے کی غرض سے اُس سول CIVIL اور فوجی بیوروکریسی نے اپنی خدمات فراہم کیں جو اس دور میں ایک نابالغ بورژوازی اور ایک ضعیف جاگیردارانہ نظام کے اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے ناگزیر ہوتی ہیں۔

مختلف طبقوں اور قوتوں کا یہ اتحاد اتنا ہی انوکھا جانور تھا جتنا کہ وہ روایتی اونٹ جسے کسی کمیٹی نے مرتب کیا تھا۔ دلچسپ سوال یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اجنبی درندے کو پالتو بنانے کے عمل میں اس اتحاد کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی ذہنی کیفیت خوف، بے یقینی اور ابہام کی سی تھی۔ بیوروکریسی کو انجینئرنگ کے بڑے منصوبوں پر کام کرنا تھا، مثلاً دریاؤں پر بند باندھنا اور مسلح افواج کو جدید طرز پر لانا چنانچہ بیوروکریسی اور اُبھرتے ہوئے صنعت کاروں کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ معاشرے کے دروازوں کو کسی حد تک کھولنا پڑے گا تاکہ تھوڑی سی ٹیکنالوجی معاشرے میں داخل ہوسکے

لیکن یہ دونوں اوران سے کہیں زیادہ جاگیردار، طبقہ اس بات سے خائف تھے کہ سائنس کے معاشرے کی گہرائیوں میں گھس جانے کے دوررس اثرات نہ معلوم کیا ہوں گے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ حکمران طبقے سائنس کے استعمال پر تو مجبور ہوئے ، لیکن وہ سائنسی رویئے اختیار نہ کر سکے۔ صرف یہ نتیجہ اس دلیل کی توثیق کرتا ہے کہ جب ٹیکنالوجی ملک میں آئی تو اُس کی نوعیت ملک میں محض درآمدی اشیاء کی سی تھی ، اور معاشرے کے اندرونی تقاضے نہ اُس پر اثر انداز ہوئے اور نہ اُسے کوئی فروغ دے سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسکول اور یونیورسٹی میں سائنس کی تعلیم کی طرف واجبی سی توجہ دی گئی ، اور سائنس کو میکانکی ، غیر تخلیقی اور بجھے بجھے انداز سے پڑھایا جاتا رہا جس طرح کبھی کوئی کڑوی گولی نگلنی پڑ جاتی ہے ، اور یہ بھی کہ پاکستان میں سائنسی تحقیقات کا میدان ایک وسیع ویرانہ نظر آتا ہے ۔ ہم عصر تقاضوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے حکمران اتحاد نے ، ملکی وسائل کے بارے میں جو تناظر اختیار کیا ہے ، اُس کے ، اور اُن کے گرد معروضی حقائق کے درمیان جو بہت بڑا خلا ہے ، اُس کا منطقی ماحصل یہی ہو سکتا تھا ۔

اس کے برعکس ہندوستان میں جو صورتحال ہے اُسے مختصراً دُہرا لینے سے بصیرت ملتی ہے آزادی کے فوراً بعد وہاں کے قدرے بالغ اور امتیازی حیثیت رکھنے والے بورژوا طبقے نے حکومت کے ساتھ مل کر سائنس اور ٹیکنالوجی کو خود معاشرے کے اندر سے نشو ونما دینے کا عمل جاری کیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نہ صرف سماجی و اقتصادی ترقی کے مستحکم ستون ہیں بلکہ خود اُن کی اپنی بقا کے ضامن بھی ۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانی معاشرے میں سائنسی رویئے بھی اپنائے جانے لگے ۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اُن کا وجود صرف تعلیم یافتہ متوسط طبقے تک محدود رہا ہے ۔

پاکستان میں حکمران طبقوں کا سائنس کے بارے میں تناظر یہ رہا ہے کہ اس بُری شے کو برداشت تو کرنا ہو گا لیکن اس کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی بھی ضروری نہیں ہے ۔ آزادی کے بعد کے برسوں میں آرٹ اور کلچر کی نشو ونما پر اس بات کے دوررس اثرات پڑے ، حکومت نے

آرٹ کے تمام شعبوں کو خود ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے، کہ وہ تیمی کی موت مر جائیں یا جیسے بھی جی سکتے ہیں، جیئیں۔ اور حکومت کی توقع یہ رہی ہے کہ سائنسی یعنی عقلی رویّوں سے محروم اس خلاء میں، آرٹ کے شعبے بے سمت اور بے مقصد زندگی بسر کریں گے، یعنی سماجی مقصدیت کی "وباؤں" سے محفوظ۔ اور یوں وہ نظریاتی قطبیت اختیار نہیں کریں گے اور اس کے نتیجے میں آرٹ اور کلچر حقیقی جمہوری تبدیلی حاصل کرنے کے آلۂ کار نہیں بن سکیں گے۔

آرٹ کی اس فرضی بے بسی میں مزید اضافہ کرنے کیلئے حکمران طبقوں نے شعوری طور پر پاکستانی معاشرے کی علیحدہ قومی ثقافتوں کو دبانے کے لئے باقاعدہ تدبیریں اختیار کیں، اور ظاہر ہے کہ یہ سب اُس مقدس وفاقی اَمانت کے نام پر کیا گیا جس کے تحت پاکستانی کلچر کی وحدت کا حصول سب سے عظیم نصب العین تھا، خواہ وہ زبردستی ہی کیوں نہ کرنا پڑے، یوں حکمران طبقوں کی کوشش رہی ہے کہ آرٹ کو سرکے میں اچار کی طرح محفوظ رکھا جائے۔ اور اُس کا ایک ایسا نعرہ ہو جس پر کسی کو اعتراض نہ ہو اور جو کسی کو نقصان نہ پہنچا سکے یعنی "آرٹ برائے آرٹ"۔

حکومت کی ان تدابیر کے نتیجے میں معاشرے میں جذباتی اور ذہنی سطح پر یقیناً بہت سی الجھنیں پیدا ہوئی ہیں اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یوں حکمران اتحاد نے اپنے لئے وقت خرید لیا ہے، اور یہ کہ ان الجھنوں سے کام لیتے ہوئے، اُن کے لئے حالتِ موجودہ کو برقرار قائم رکھنا اور زیادہ آسان ہو جائے گا۔

لیکن کہیں بھی عوام کے مقدر کا فیصلہ اُس کے حکمران طبقوں کے ہاتھوں میں نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہو سکتا ہے اور ہوتا بھی ہے، کہ اپنی بقاء کے لئے حکمران طبقے عوام کے مقدر کے حصول میں کچھ عرصہ کے لئے رکاوٹیں پیدا کریں۔ لیکن تاریخ میں اس سچائی کے بہت سے دلائل ملتے ہیں کہ جب کسی حکمران طبقے کو نئی تاریخی قوتیں للکارتی ہیں تو اُس طبقے کے قدامت پسند تقاضے اُس کی بینائی پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور یوں وہ تاریخ

کے ہم عصر تقاضوں کو نہیں پہچان سکتا۔ چنانچہ مثال کے طور پر وہ یہ نہیں سمجھتا کہ معاشرے کی وہ الجھنیں جن پر اُس کی بقاء کا فرضی انحصار ہے، خود وہی الجھنیں اس بات کی علامت ہیں کہ تبدیلی کا عہد آن پہنچا ہے۔

عقلی الجھنوں یا تخمیر کا تاریخی مرحلہ اس بات کی نشانی ہے کہ سماجی تبدیلی کے لئے معروضی حالات تیار ہیں، اب یہ عوام کے وسیع تر اجزاء کا مقرّرہ کام ہے کہ وہ تاریخ کے اس سبق کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ حاکموں نے ہمیشہ یہ سمجھ رکھا تھا کہ کلچر کی الجھنوں کو وہ اپنے مفاد میں استعمال کر سکتے ہیں۔ عہدِ تخمیر کے اصل وارث عوام ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ ظاہر ہے کہ خودکار انداز سے نہیں۔ تاریخ کی پیش قدمی کوئی میکانکی سلسلۂ عمل نہیں ہوتا۔ معروضی اعتبار سے ابھرتی ہوئی قوتّوں کو بھی کچھ عرصہ کے لئے روکا جا سکتا ہے اور حالانکہ یہ صحیح ہے کہ بالآخر فتح اُنہی کی ہوگی، دیکھنا یہ ہے کہ انسانیت کو کتنی قربانیاں دینا ہوں گی، اُسے کتنی اذیّتیں سہنا ہوں گی، کتنا وقت حاصل کیا جائیگا یا پھر کھو دیا جائے گا، اس سے پہلے کہ قدیم عہد اپنا زمانۂ حمل مکمل کرے اور تاریخ کے متعیّن شدہ وارث کو جنم دے، ان سب کا انحصار اس بات پر ہے کہ متضاد طبقات کی نسبتی طاقت کیا ہے اور وہ کتنے شعور کے ساتھ تاریخ کی پیش قدمی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

تاریخ کی ترقی پسند قوتّوں کے ساتھ کام کرنا، پرانے عہد کی مہلک اصلیت کو واضح کرنا اور معاشرے میں اُن قوتّوں کی نشاندھی کرنا جو پرانے عہد کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں، تاریخ کی عقلی پیش قدمی کے بارے میں لوگوں کو بینائی عطا کرنا، اُنہیں یہ بتانا کہ سماجی رشتوں کا اگلا تاریخی درجہ حاصل کرنا کیوں ضروری ہے، اور اُن کے وہاں تک پہنچنے کا راستہ منوّر کرنا، یہ سب آرٹ کا سماجی کردار اور اُس کی ذمہ داری بنتے ہیں۔ پرانے عہد کی باسی ہوا کو رفع کرتے ہوئے نئے عہد کے حصول کے لئے ایک تازگی کی فضا

میسّر کرنا۔

تو یہ واضح ہوا کہ عقلی روّیے اختیار کئے بغیر کوئی صحیح آرٹ وجود میں نہیں آسکتا جس کا مطلب یہ ہوا کہ سائنسی روّیوں کی زرخیز زمین کا اور آرٹ کے پھلنے پھولنے کا آپس میں ایک نامیاتی رشتہ ہے۔ پاکستان میں ۴۷ء کے بعد آرٹ کے مختلف شعبوں کو کانٹوں بھرے خودرو پودوں کی مانند ثقافتی اور ذہنی الجھنوں کے بیچ میں سے اپنا راستہ بنانا پڑا ہے، تاکہ وہ اپنا سماجی کردار اور اپنے سفر کی اگلی منزل متعین کر سکیں۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا، پاکستان میں صفائی سے تراشہ ہوا صرف ایک طبقہ نہیں، بلکہ مختلف طبقات اور مفاد پرست گروہوں کا ایک اتحاد حکومت کرتا ہے، اور اس اتحاد میں خارجی قوتیں بھی شامل ہیں۔ اس اتحاد کے اجزاء یعنی جاگیردار، گماشتہ اور ابھرتی ہوئی بورژوازی، بیوروکریسی اور اُن کے بیرونی سرپرست ہر وقت ایک ہی سمت میں یکساں طور پر کوشاں نہیں ہوتے، اور کبھی کبھی اُن کی آوازیں بے آہنگ بھی ہو سکتی ہیں۔ بالخصوص اس موضوع پر اُن میں آپس میں اہم اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ کلچر، تعلیم اور آرٹس کے حوالے سے "عوام کو کیا دیا جائے اور کیا نہ دیا جائے"

مزید براں یہ کہ اُبھرتے ہوئے بورژوا طبقے کے اراکین اور سول اور فوجی بیوروکریسی کے اراکین، جاگیردار خاندانوں سے صرف اس حد تک مختلف ہیں کہ ان اراکین کے اندر سرمایہ داری کے رجحانات تو موجود ہیں، لیکن خود ان کا کلچر اپنے جوہر میں ابھی تک جاگیردارانہ ہے۔ اور ان کے یوں "دو قسمی" ہونے کے باعث ان کے اندر بڑا تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ کلچر کے مقاصد کے بارے میں ان کے ذہنوں میں جو الجھنیں پہلے سے موجود ہیں، وہ اس تناؤ کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔

اس بات کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ شہر کا بیشتر بورژوا طبقہ اور پرولتاریہ، صرف جغرافیائی اعتبار سے شہری کہلائے جا سکتے ہیں، لیکن کلچر کے حوالے سے ابھی تک نہیں۔

وہ قصبوں اور دیہاتوں میں غلامی کی زندگی پیچھے چھوڑ کر صرف دو ایک پشت پہلے شہری زندگی میں داخل ہوئے ہیں اور ابھی کچھ وقت درکار ہے، اس سے پہلے کہ ان کے اقدار اور نفسیات شہر کی سماجی و اقتصادی رشتوں سے مطابقت حاصل کریں۔ فی الحال شہری کلچر کی نمایاں علامتیں صرف کراچی میں واضح طور پر نظر آتی ہیں اور وہ بھی صرف اُن مقامی مہاجر گروہوں میں جن کا روایتی پیشہ تجارت رہا ہے۔

ایسے وقتوں میں اقتدار کے قلعوں سے باقاعدہ خطیبانہ انداز میں یہ کہا جاتا ہے کہ روحانی فیضان اور رہنمائی حاصل کرنے کے لئے کیوں نہ ہم اپنے "شاندار ماضی" کی طرف نظریں لوٹائیں۔ اور حکومت کے تمام ماس میڈیا لوگوں کو یہ باور کرانے کے لئے عمل میں لائے جاتے ہیں کہ اگر ہم اپنے "شاندار ماضی" میں دوبارہ جان ڈال دیں اور اُس کے تمام ساز وسامان اور لوازمات سمیت اُسے پھر اس دور میں لا کھڑا کریں تو ہمارا ملک ترقی پذیر سے ترقی یافتہ ہونے کا فاصلہ بہت جلد طے کرلے گا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ سوچنے کا یہ انداز خاص جاگیردارانہ نظام کی عکاسی کرتا ہے۔

لیکن پھر وہ وقت آتا ہے جب لوگ کہنے لگتے ہیں کہ "ہم اپنے ماضی کو تحسین کی نگاہوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں یا پھر اُس پر تنقیدی نظر ڈال سکتے ہیں"، اور تب جا کر اس دلیل کے اصل معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ مثال کے طور پر انیسویں صدی کے یورپ میں مارکس کی فکر کی پیدائش کے لیے یہ ضروری تھا کہ اُس سے پہلے کی صدیوں میں عینیتی اور مابعد الطبعیاتی فکر کے دور سے گزر چکا ہو۔ لیکن اس کے نتیجے میں ایک اور دلیل ذہن میں ابھرتی ہے جو زیادہ اہم لیکن کم واضح ہے، کہ اگر آج پاکستانی معاشرہ کلچر کے حوالے سے الجھنوں میں پھنسا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سرزمین کلچر ہی کے حوالے سے پچھلے دور میں ساکت اور بنجر تھی یوں یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے ماضی کو صحیح تناظر میں پرکھ سکے۔ اور یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ماضی اور حال کا آپس میں صحیح رشتہ صرف اور صرف جدلیاتی ہے، نہ کہ جذباتی۔

جب یہ بات ایک بار سمجھ لی جائے تو روایت کو کلی طور پر قبول کر لینا یا کلی طور پر رد کر دینا یکساں بیہودہ فیصلے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دیگر بیہودہ مفروضے بھی مسترد کیے جا سکتے ہیں، مثلاً یہ کہ پاکستانی عوام کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا آغاز محمد بن قاسم سے ہوا یا یہ کہ گندھارا اور موئنجودڑو محض عجائب گھر کے نمونے ہیں جنہیں بس جاپانی سیاحوں کو محظوظ کرنے کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد دلیل کا ایک ایسا لقمہ سامنے آتا ہے جسے پاکستان کے جاگیرداری دستر خوان پر بیٹھ کر نگلنا بہت ہی مشکل ہے۔ اور وہ دلیل یہ ہے کہ ہندو روایات بھی تو اپنے جوہر میں، پاکستان کے ماضی کا ایک جزو ہیں۔

جب ایسے تناظر اور ایسے جدلیاتی رویّے کو اپنایا جائے تو تاریخ کی صحیح تشخیص ممکن ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہم تیرھویں صدی کے امیر خسرو جیسے عظیم انسان کے کام اور فکر کو اُس کے عہد کے حوالے سے اور آج اپنے حوالے سے، صحیح طور پر پرکھ سکتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ اُس کے عہد کی سلطنت شاندار تھی، لیکن اُس کے عہد کی تہذیب صدیوں بعد تک بنجر اور منجمد رہی۔ اور ہم اس بات کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں کہ شاہ لطیف اور غالب کی، اُن کے اپنے اپنے زمانوں میں کیا ضرورت تھی اور آج ہمارے لیے اُن کی کیا اہمیت بنتی ہے، پھر یہ جانتے ہوئے کہ یہ عظیم انسان ایسے دور میں پیدا ہوئے جو زوال کے عمل سے گزر رہا تھا۔

یہ تاریخی تناظر اور یہ سائنسی رویّہ ہمارے اپنے دور کے تجزیے کا واحد طریقِ کار ہے۔ مثلاً یہ طریقِ کار، ہمیں یہ دکھاتا ہے کہ حالیہ دور پاکستانی عوام کے لئے مایوس کن نہیں بلکہ تاریخی اعتبار سے ایک انتہائی پُر امید دور ہے، کیونکہ نہ صرف یہ کہ یہ ایک سماجی تنزّل کا دور نہیں ہے بلکہ یہ کہ یہ ایک تبدیلی کا عہد ہے، جس میں الجھنوں کا موجود ہونا لازمی

ہونے کے باعث، ہمیں قبول ہے ۔

آج یوں نظر آتا ہے کہ ایک مخصوص سماجی و اقتصادی نظام کی اقدار معاشرے پر غالب ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس نظام کے تنزّل کی علامتیں بھی نظر آنے لگ گئی ہیں ، اور اگلے تاریخی نظام کے بیج پھوٹنا شروع ہو گئے ہیں جدلیاتی فارمولا FORMULA بالکل واضح ہے : بوسیدگی، پھر اُس کے بعد ابتری ، اور پھر اُس کے بعد وضاحت ۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے ، یہ یہ جدلیاتی طریقہ خودکار اور میکانکی انداز سے عمل میں نہیں آتا ، اور ضروری ہے کہ ہم اُن نام نہاد مایوس کن عناصر پر بھی نظر ڈالیں جو کچھ لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث بنتے ہیں ۔

(مضمون جاری ہے آئندہ ملاحظہ فرمائیں)

فیضؔ ۔ شعلۂ رخسارِ حقیقت

سید جعفر احمد

فیض احمد فیضؔ کو ہماری بزمِ ادب سے رخصت ہوئے دو سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ دو سال کسی کی یاد کی شمع کے بجھ جانے کے لئے کوئی کم عرصہ نہیں ہے۔ کم از کم اس عرصے میں شمع کی لَو تو مدھم پڑ ہی جاتی ہے۔ مگر فیض کی یاد آج بھی دلوں کو اسی طرح گرما رہی ہے جس طرح اب سے دو سال قبل گرما رہی تھی۔ اس پورے عرصے میں دنیا کا کونسا خطّہ ہوگا جہاں انکی یاد میں محفلیں نہ منعقد ہوتی ہوں اور آنسوؤں کے نذرانے نہ پیش کیے گئے ہوں۔ ان کے ہمنواؤں اور قدر دانوں ہی نے نہیں بلکہ نکتہ چینوں نے بھی گاہے مصلحتًا اور گاہے اعترافِ حقیقت کے سوا کوئی چارہ کار نہ پاتے ہوئے اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پاکستان اور ہندوستان کی ادبی محفلیں ہوں یا امریکہ، برطانیہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں مقیم تارکینِ وطن کی بیٹھکیں، یا پھر ارضِ فلسطین کی خون آشام شاموں میں لہو کے چراغوں سے منور خندقیں ہوں، فیضؔ دنیا میں کہاں یاد نہیں کیے گئے۔ ان کی موت، ناموسِ ادب کے پرستاروں پر کیا ظلم توڑے گی، اس کا کچھ احساس شاید فیضؔ کو خود بھی تھا اسی لئے انہوں نے کہا تھا ؎

اک گل کے مرجھانے پر کیا گلشن میں کہرام مچا
اک چہرہ کمھلا جانے سے کتنے دل ناشاد ہوئے

گلشن میں گل تو روز ہی مرجھاتے ہیں اور کونسا لمحہ ہوتا ہوگا جو چہروں کے کمھلانے کے احکام نہ لاتا ہو۔ مگر نہ تو ہر گل کے مرجھانے پر کہرام مچتا ہے اور نہ ہی ہر چہرے کے کمھلانے پر دل ناشاد ہوتے ہیں۔ البتہ فیض کے عالمگیر سوگ کا سبب یہ ہے کہ وہ اُس گل کے

_____ مانند تھے جو پورے گلشن کی آبرو ہوتا ہے، انکا چہرہ بھی اک فرد کا چہرہ نہیں تھا بلکہ اس چہرے میں تیسری دنیا کا اجتماعی کرب کچھ اس طرح سے منعکس ہوا تھا کہ وہ ہمارے عہد کا آئینہ بن گیا تھا۔ فیض کی موت اسی آئینے کا ٹوٹ جانا تھی، سو اس پر بچھنے والی صفِ ماتم اگر دراز ہوتی جاتی ہے تو اس میں چنداں حیرت نہیں ہونی چاہیئے۔

جو چیز فیض کے عالمگیر سوگ کا سبب ہے وہی انکی بقائے دوام کا بھی راز ہے۔ فیض تمام عمر انسانیت کی دشمن قوتوں کے خلاف لڑتے رہے۔ اور یہ لڑائی انہوں نے اس ایقان کے ساتھ لڑی کہ بالآخر انسانیت کی حریف قوتیں نامراد ہوں گی اور انسان جیت جائیگا۔ وہ طبقاتی تقسیم ہو یا رنگ و نسل کے امتیازات، آمریتوں کے ہاتھوں انسانی شرف و وقار کی پامالی ہو یا امن عالم کو لاحق جنگ و تباہی کے مستقل خطرات، فیض نے اپنے عہد کی ان تمام بے بضاعتیوں کی تصویریں کچھ اس انداز سے پیش کی ہیں کہ ہر تصویر کے اندر پر امید مستقبل کے رنگ بھی شامل کر دیئے ہیں اور یوں انکی شاعری بجائے خود ایک فعال قوت بن گئی ہے جو ہر آنے والی نسل کو عمل پر اکساتی رہے گی۔

غالب نے شمع کے بجھنے پر دھواں اٹھنے اور اپنے بعد شعلۂ عشق کے سیہ پوش ہو جانے کا اعلان کیا تھا مگر فیض پُر امید رہے کہ ؎

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

فیض کی شاعری میں انسانیت کی یہ رجائیت سے پُر نمائندگی دراصل ان کے سماجی شعور اور تاریخی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ وہ ایک سچے شاعر تھے اور سچی اور حیات آفریں شاعری کا وصف ہی یہ ہے کہ وہ شاعر کی شمع حیات گل ہونے کے بعد بھی انجمن کو منور رکھتی ہے، خود بھی زندہ رہتی ہے اور ہر دور میں تحصیلِ ذات کے عمل میں مصروف انسان کو مدد بھی پہنچاتی رہتی ہے۔

فیض کی شاعری کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ روایت کے دائرے میں رہتے ہوئے انقلابی شاعری ہے۔ انہوں نے اُردو کی شعری روایت سے، اس کی لغت اور ڈکشن سے بھرپور

استفادہ کیا ہے مگر اس میں مضامین اپنے عہد کے حوالے سے باندھے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں انکے یہاں ہماری روایتی شاعری کی زبان نئے مفاہیم سے آشنا ہوتی ہے ۔ قاتل، حسرت، انتظار شام، صبح، درد، راحت، لہو ۔ ان سب لفظوں کو انہوں نے نئے معانی دیئے ہیں، پرانی تلمیحات میں انہوں نے نئی جان ڈال دی ہے ۔ دامن یوسف، سنت منصور اور ایسی ہی دوسری تراکیب کے مطالب بدل گئے ہیں ۔ اسی تجربے سے انکا منفرد اسلوب وجود میں آیا ہے ۔

ہماری روایتی شاعری ذاتی کرب اور داخلی حوادث کی ترجمان تھی ۔ اس میں درد والم کی حسرتناکیوں کا بیان ہوتا تھا ۔ عشق و ہوس کے معنی اور معیار بھی شاعر کی داخلی ضروریات سے متعین ہوتے تھے ۔ روایت کے اس پورے نظام میں خارجی ماحول، دنیا کے مسائل اور خود انسان کے ذاتی تجربات کے خارجی اسباب کا ذکر نہیں ہوتا تھا بلکہ ان حوالوں کے بارے میں سوچنا بھی معیوب اور جذبۂ عشق کے کسر شان سمجھا جاتا تھا ۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ساری روایتی شاعری میں کہیں بھی اس میلان سے علیحدگی اختیار نہیں کی گئی مگر مجموعی طور پر اس شاعری کا مزاج داخلیت پسندی ہی کا رہا ۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے ہندوستان گیر فسادات نے ہماری تہذیبی اقدار میں غیر معمولی تبدیلیوں کا آغاز کیا، ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کے رہے سہے اقتدار کا خاتمہ اور دہلی کے مسند اقتدار پر انگریز کا تسلط محض سیاسی واقعات نہیں تھے جنکو سماجی ماحول سے لاتعلق رکھ کر دیکھا جاسکے، یہ دراصل ایک ایسے تہذیبی ڈھانچے کی شکست تھی جو برسوں سے جمود کا شکار تھا اور جس میں تخلیق و ایجاد کے سوتے بڑی حد تک خشک ہو چکے تھے ۔ برصغیر میں برطانوی مقاصد کے بارے میں کسی ابہام کی گنجائش نہیں ہے ۔ ظاہر ہے برطانیہ یہاں اپنے استعماری مقاصد کی جستجو ہی میں داخل ہوا تھا اور اسکا مقصد اپنے ساحل سے ہزاروں میل پر واقع ایک پسماندہ معاشرے کو جدید دور کی خوبیوں سے متعارف کرانا نہیں تھا ۔ البتہ انگریز کی یہاں آمد بجائے خود نئے رجحانات کے ہندوستان میں متعارف ہونے کا ایک ذریعہ ثابت ہوئی ۔ انگریزی حکومت کو یہاں ایسے اداروں اور افراد کی ضرورت تھی جو اس کے استعماری مقاصد میں معاونت کر سکیں ۔ چنانچہ اُس کی پالیسیاں خواہ وہ

آئینی اصلاحات سے متعلق ہوں یا تعلیم سے، یا پھر انکا تعلق اس کی معاشی حکمت عملی سے رہا ہو، ان سب کا مقصد ہندوستان میں اپنی حکمرانی کے لئے سہولت بہم کرنا اور اپنے قیام کو طول دینا تھا۔

ہندوستان میں یہ دور تہذیبی اکھاڑ پچھاڑ کا دور ثابت ہوا۔ پہلی مرتبہ ہندوستانی ذہنوں نے مربوط انداز میں اپنے زوال کے اسباب پر غور کیا اور معاشرتی جمود کے حوالے سے نئے طرز فکر کی بنیاد ڈالی۔ اس عمل کی ابتداء تو غالب اور سرسیّد احمد خان ہی سے ہو گئی تھی مگر اسکو زیادہ ہمہ گیر انداز میں بیسویں صدی کے ابتدائی ربع میں فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں ہندوستانی میں اصلاحی تحریکوں کا دور دورہ ہو چکا تھا۔ ان تمام کاوشوں کو ایک معنی انگیز جہت ۱۹۱۷ء کے سوویت یونین کے انقلاب سے میسّر آئی۔ سوویت انقلاب دنیا کی بیشتر نوآبادیات میں قومی آزادی کی تحریکوں کے لئے ایک محرک قوت ثابت ہوا۔ خود ہندوستان میں آزادی کی تحریک پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے جس کے ابتدائی مظاہر ۱۹۲۰ء کے عشرے ہی میں سامنے آنے لگے تھے ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز ہوا جو نئے سماجی شعور کی آئینہ دار تھی۔ یہ سماجی شعور تاریخ کے جدلیاتی عمل کی تفہیم پر استوار ہوا تھا۔ ادب اور شاعری میں اس نے فنکاری کی نئی نئی جہتیں پیدا کیں۔ خود شخصیت کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کے بارے میں ایک نئے طرز احساس نے جنم لیا اور من و تُو کی تفریق کو نیا تناظر میسّر آیا۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری اپنے مضمون "ادب کی جدلیاتی ماہیت"، میں جو ۱۹۴۶ء میں پہلی بار شائع ہوا، اس انقلابی سماجی شعور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ادب کے نئے تصور کی ابتداء مارکس کے فلسفہ سے ہوتی ہے اور اسکا تعلق عالمی اقتصادی تمدنی تحریک سے ہے جو اشتراکیت کے نام سے یاد کیجاتی ہے۔ مارکس مادّہ کی اولیت کا قائل تھا اور اسکا فلسفہ مادیت کہلاتا ہے لیکن اس،

مادیت اور قدیم مادیت کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ مارکس مادّہ کو متحرک بالذات مانتا ہے۔ حرکت مادّہ کی فطرت ہے اور تغیر، انقلاب اور ترقی اس کی دائمی غایت ہے۔ مادہ حرکت کرتا ہے اور یہ حرکت جدلیاتی ہوتی ہے۔ یعنی ایک صورت خود اپنی تردید کرتی ہے اور اس تردید سے پھر نئی صورت پیدا ہوتی ہے جو پہلی صورت سے بہتر ہوتی ہے، گویا مثبت سے منفی اور منفی سے نیا مثبت وجود میں آتا ہے اور اس مثلثی حرکت کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا ہے۔ حرکتِ مادّی ایک مسلسل اور غیر متناہی ارتقائی تواریخ ہے مادّہ کے اس نئے تصور کو اگر مان لیا جائے تو وہ تمام اختلافات ختم ہو جاتے ہیں جو مادّہ اور نفس، جسم اور روح خارجی اور داخلی اور عملی اور تصوری کے بے بنیاد امتیاز کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں اس لئے کہ مادّہ اور شعور میں دراصل کوئی تضاد ہے نہیں۔ شعور مادّہ کے اندر موجود ہے اور اس کی ازلی اور ابدی خصوصیت ہے۔ مادہ کے ساتھ شعور بھی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف مائل ہے اور مسلسل ارتقائی منازل طے کرتا چلا آرہا ہے۔[1]

اس انقلابی تصور کے زیر اثر ایک ایسے طرز فکر نے فروغ پایا جو فرد کے داخلی بحرانوں کو معاشرے کے درو بست اور اجتماعی انسانی کیفیات سے مربوط کر کے دیکھتا تھا۔ اس رجحان کے تحت غم جاناں اور غم دوراں کی حدیں ختم ہو گئیں اور دونوں کے امتزاج سے ایک ایسے غم کی صورت وجود میں آئی جو بیک وقت فرد کا ذاتی غم بھی ہے اور معاشرے کا اجتماعی غم بھی۔ یہ بھی اسی رجحان کا نتیجہ ہے کہ کوئے یار اور مقام دار، دونوں کارگاہِ ہستی کی دو امتحان گاہیں ٹھہریں۔ فیض اردو شاعری میں اس نئے طرز فکر کے سب سے بڑے علمبردار ہیں اور ان کی شاعری اسکی نمائندہ ترین شاعری ہے۔ وہ محبت کے غم کو زمانے کے دیگر غموں اور وصل کی راحت کو دیگر راحتوں سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ بلکہ دونوں کو ایک ساتھ برتتے ہیں

کم رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم بے حساب یاد آئے

غمِ ذات اور غمِ کائنات کے اس امتزاج کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے ایک ایسی کیفیت جنم لیتی ہے جس میں مایوسیوں اور حرماں نصیبیوں کی جگہ رجائیت کے امکانات روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ فرقتِ یار اور گراں باریٔ ایام کے باوجود لہجہ میں عزم و یقین کی کارفرمائی غالب رہتی ہے اور شاعر یہ نشاط انگیز مژدہ سناتا ہے ؎

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

یا ؎

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے۔
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے۔
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے

قطار اندر قطار کر لوٹی
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے۔
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے۔

فرد کی ذاتی اداسیاں اور آسودگیاں کس طرح انسانیت کی وسیع تر اداسیوں یا آسودگیوں کا حصّہ ہیں اس کو فیض نے حیدرآباد جیل سے اپنی بیگم ایلس کے نام ایک خط میں بڑے اچھے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ اپنے کسی خط میں ایلس نے اپنے احساسِ بے چارگی کا ذکر کیا جس سے ان دنوں وہ گزر رہی تھیں۔ حسنِ اتفاق سے انہیں دنوں جیل میں فیض نے جیمس آلڈراج کا ناول "دی ڈپلومیٹ" پڑھا تھا۔ اس ناول کو حوالہ بنا کر انہوں نے "تنہائی اور بیچارگی کے احساسات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:۔

"ناول کا موضوع تو ایران میں برطانوی ریشہ دوانیاں ہیں لیکن اس کی خوبی موضوع کی وجہ سے نہیں ہے۔ خوبی اس اخلاقی اور جذباتی کشمکش کے بیان میں ہے جو عالمگیر قوتیں ایک فرد کی ذات پر نازل کرتی ہیں اور اس بارے میں کہ یہ اکیلی جان اس کشمکش کی صلیب سے کیسے عہدہ برا ہوتی ہے۔ ایک طریقے سے اس میں اس بے چارگی اور مایوسی کا جواب ملتا ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ یہ احساس ہمیں اس لئے گھیرے رہتا ہے کہ انسانی مسرّت کی جدوجہد بظاہر اتنی طویل اتنی گراں اور اتنی دائمی معلوم ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں ایک فرد کی ذات بالکل ہیچ اور نزار دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ جبھی ہوتا ہے اگر تم اس جدوجہد کو ایک فرد کی نظر سے دیکھو بلکہ یہ کیفیت پیدا ہی اس وجہ سے

ہوتی ہے کہ ہم انسانی رنج و ناخوشی کے مسئلے کو ذاتی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن
ان مسائل کو انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھنا حماقت ہے اس لئے کہ انسانی رنج و
راحت ہمارا تمہارا ذاتی یا انفرادی مسئلہ نہیں ہے۔ جیسے کسی شخص کے عاشق
یا اپنے بچّے کی علالت ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ اگر یوں نہیں ہے تو اسے دیکھنے کا
ایک ہی صحیح طریقہ ہے اور وہ اجتماعی نقطۂ نظر ہے۔ اگر اس نظر سے دیکھو تو
یہی جدوجہد شجاعانہ، بامقصد اور امید افزا نظر آتی ہے۔ اس طور سے مسائل
پر نگاہ ڈالنا مشکل اس لئے ہوتا ہے کہ ہم لوگ اپنی خود پسندی کی وجہ سے
کبھی پوری طرح اقرار نہیں کرتے کہ ہماری ذات قطعی غیر اہم ہے۔ میں نے
ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انسانی رنج اور ناخوشی کی بنیاد دراصل یہی خود پسندی
ہے یعنی اپنی ذات سے بہت زیادہ اہمیت وابستہ کرنا۔ افسردگی، بددلی اور
خود ترحمّی کے احساسات کی تہہ میں بھی یہی گلہ کارفرما ہوتا ہے کہ ساری کائنات
ہماری ذاتی تمناؤں کے مطابق کیوں تشکیل نہیں دی گئی۔ دراصل ہمارے تمہارے
جیسے لوگ جن کی شخصیتیں بالکل مکمل اور مربوط نہیں ہیں۔ اپنی ذات کو اس ذات
کی حدود سے پرے زیادہ بڑی چیزوں سے یک جان نہیں کر سکتے جس کے نتیجے میں
ناخوشی اور شکست کا احساس لازمی ہے۔[1]

فیض انسان کی ذات اور فرد کی داخلیت کی نفی نہیں کرتے بلکہ انہیں خارجی ماحول سے
مربوط کرتے ہیں۔ وہ کشمکشِ ذات کو، فرد کے داخلی آشوب کو کشمکشِ زمانہ سے ملا دیتے ہیں۔ یہ
رویّہ ہماری روایتی شاعری کے رویّے سے یکسر مختلف رویہ ہے جس میں آلامِ روزگار کو آسان بنانا
بھی مقصود ہوتا تو صرف اس طرح کہ اسے غمِ جاناں بنا لیا جاتا۔ حسرت موہانی کا شعر اس کی مثال ہے۔[2]

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

البتہ ہماری روایتی شاعری میں غالب کے یہاں غمِ جہاں اور غمِ ذات کے حوالے سے ایک ایسا رویّہ نظر آتا ہے جسے تبدیلی کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اس لحاظ سے فیضؔ، غالبؔ کے رویّے سے قریب تر ہیں۔ انہوں نے خود کہیں لکھا تھا کہ انکے نزدیک غمِ جاناں اور غمِ دوراں ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ یہ تجربہ ایک زیادہ ہمہ گیر تجربہ ہے جس میں عشق کے مسائل کے ساتھ ساتھ سیاست و معیشت کا بھی گزر ہے مگر شاعری میں یہ سب فنکارانہ پیرائے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو فیضؔ کی شاعری کا یہی پہلو ناگوار گزرتا ہے کہ اس میں سیاست کی باتیں کیوں جگہ پاتی ہیں۔ چنانچہ رشید حسن خاں اپنے مضمون "فیضؔ کی شاعری کے چند پہلو" میں معترض ہیں کہ:

"اس دنیا میں صرف قید خانے نہیں، اور نہ انسانی تصوّر ماتمِ آزادی تک محدود ہو سکتا ہے۔ گریز پا سیاسی مسائل کے بیان میں اور نظریاتی وابستگی کی تفسیر میں اتنی ہمہ گیری نہیں ہوتی کہ وہ عام انسانی تصورات کی طرح وسیع الذیل بن سکے۔ اُن کے یہاں جو یکسانیت ہے، وہ بلآخر ذہن کو تھکا دیتی ہے۔ انہوں نے اب محدود سیاسی اثرات کو اپنا موضوع قرار دے رکھا ہے، اس لئے اُن کے کلام کا بڑا حصّہ ایک فنا آمادہ جد و جہد کے بیان پر مشتمل ہو کر رہ گیا ہے۔"[۲۱]

بجا کہ اس دنیا میں صرف قید خانے نہیں ہیں مگر اس کو کیا کہیئے کہ جو قید خانے ہیں وہ انسانی تجربے کا حصّہ ہیں۔ انسانی تصور یقیناً ماتمِ آزادی تک محدود نہیں ہے مگر اس سے کیونکر انکار کیا جائے کہ یہ غلامی ہی ہے جو انسانی تصور کو مسخ کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال سے کس طرح عہدہ برا ہوا جائے۔ کیا انسانی تجربے کا وہ حصّہ جو قید خانوں پر محیط ہے صرف اس لئے نظر انداز کر دیا جائے کہ اس کے علاوہ بھی انسانی تجربے کے کچھ پہلو موجود ہیں۔ یا ماتمِ آزادی

سے یہ کہہ کر پہلوتہی کرلی جائے کہ انسانی تصور اپنے دامن میں اور بھی بہت کچھ سموئے ہوئے ہے۔ مگر بدقسمتی سے غلامی اس "بہت کچھ" کو بے معنی بنا دیتی ہے۔ غلامی کا سب سے بڑا وار تو خود انسان کے جوہر انسانیت پر پڑتا ہے۔ انسان اپنی فطرت میں تخلیق پر آمادہ ہے اور تخلیقی سرگرمی میں شعوری طور پر حصہ لینا ہی انسانیت کا جوہر ہے۔ غلامی اس جوہر پہ، انسان کی نوعی خوبی پر حملہ آور ہوتی ہے۔ چنانچہ جب تک انسان اپنے اس جوہر کی بازیافت میں کامیاب نہیں ہوتا، زندگی کی دوسری خوبیوں اور باقی ماندہ اچھائیوں سے مناسب طور پر لطف اندوز بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جبر و اختیار اور غلامی و آزادی کی کشمکش صدیوں سے انسانی تجربے کا نمایاں ترین پہلو رہی ہے اور جوں جوں انسان غلامی اور جبر کا جوا اتارنے میں کامیاب ہوتا جاتا ہے، انسانی تصور زیادہ نکھرتا اور انسانی مستقبل زیادہ محفوظ ہوتا جاتا ہے۔ یہ نکتہ اب انسان کے ذہن پر منکشف ہو چکا ہے کہ اس کے انسانی تشخص کی پامالی، غلامی ہی کی مرہون منت ہے اور یہ کہ وہ اپنی انسانی حیثیت کو بحال ہی تب کر پائے گا جب وہ جبر کے سائے سے باہر نکل آئے۔ سارتر نے فرانز فینن کی "افتادگانِ خاک" کے پیش لفظ میں اس نکتے کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے:

"باغی کا ہتھیار اس کی زندگی کی ضمانت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جنگ شروع ہو تو قتل کرنا پڑتا ہے، کسی یورپی (سارتر نے یہ بات الجزائر میں فرانس کے خلاف قومی آزادی کی تحریک کے پس منظر میں لکھی تھی) کو قتل کرنے کا مطلب ایک پنتھ دو کاج ہوتا ہے، یعنی ظالم اور مظلوم انسان دونوں ہی بیک وقت ختم ہو جاتے ہیں ایک مردہ لاش اور ایک آزاد انسان باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ زندہ شخص پہلی بار اپنے قدموں کے تلے قومی سرزمین کو محسوس کرتا ہے"

اب اگر آزادی کی جدوجہد خود انسانی تصور کی تکمیل کے لئے ضروری ہے تو پھر نظریاتی وابستگی بھی ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر یہ جدوجہد ممکن نہیں ہو سکتی۔ رہا یہ سوال کہ خود یہ جدوجہد فنا آمادہ ہے تو ظاہر ہے کہ انسانی آزادی پر اس جدوجہد کی تکمیل ہو جائے گی مگر اس

کے بعد انسانی کاوشوں کے نئے محور وجود میں آئیں گے۔ تب انسان زندگی کو زیادہ خوبصورت، زیادہ حسین اور باوقار بنانے میں مصروف ہو جائیگا مگر یہ مرحلہ تب ہی آئے گا جب انسان آج کے مرحلے سے کامیاب و کامران گزرے گا۔

فیض انسان کی اس جدوجہد میں شامل ہے جو وقتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہے اس لئے کہ یہ انسان کو اُس مستقبل کی طرف لے جا رہی ہے جہاں زندگی اپنے تمام تر حسن اور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوگی۔ ان کی شاعری کا مرکزی نقطہ انسان دوستی ہی ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس کی تفہیم کے بعد ان کی شاعری کے جملہ پہلو ہماری سمجھ میں آسکتے ہیں۔ بدقسمتی سے اب انسان دوستی کی اصطلاح بھی کثرت استعمال یا ہر کس و ناکس کے استعمال کی وجہ سے اپنی حقیقی معنویت سے محروم ہو چکی ہے۔ آج وہ لوگ بھی بلا تکلف انسان دوستی کی مالا جپتے نہیں تھکتے جن کے دم قدم سے زمین پر انسان کا عرصۂ حیات تنگ ہے۔ مگر فیض کا انسان دوستی کا تصور کسی مصلحت سے آلودہ نہیں ہوا۔ انکا انسان دوستی کا تصور ان کے تصور حیات ہی سے ماخوذ ہے۔ وہ HUMANIST ہیں مگر اُن کی HUMANISM کسی مابعد الطبیعاتی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر نہیں آتی بلکہ وہ انسانی معاشرے کے ارتقائی عمل اور تاریخ کے جدلی اصولوں کی تفہیم پر استوار ہوئی ہے۔ انسانی معاشرہ ہر لحظہ حرکت پذیر رہتا ہے۔ اس کی حرکت کے سائنسی اصول اور قوانین ہوتے ہیں۔ یہاں متضاد قوتیں باہم برسر پیکار رہتی ہیں۔ کچھ قوتیں خیر کی نمائندگی کرتی ہیں اور کچھ شر کی۔ کچھ زندگی کے استحکام کے لیے کوشاں ہوتی ہیں اور کچھ خود زندگی کے درپے ہوتی ہیں۔ کچھ بشر کی آزادی اور حریت کیلئے اپنی توانائیاں وقف کرتی ہیں اور کچھ انسان کو انسان کا غلام بنانے پر کمربستہ رہتی ہیں ایسا نہیں ہے کہ ان میں سے ایک طرح کی قوتیں انسانوں کے درمیان سے اٹھتی ہیں اور دوسری طرح کی قوتیں کہیں کسی دوسری دنیا سے آجاتی ہیں۔ بلکہ ان دونوں قوتوں کو نمائندے انسانوں

ہی کے اندر سے مل جاتے ہیں۔ ان کی کشمکش اور تصادم بھی یہی ہوتا ہے اور اس تصادم کا فیصلہ بھی یہی ہوتا ہے۔ فیضؔ جب یہ کہتے ہیں کہ ؎

اُٹھے گا جب جمّ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

تو اُن کے ذہن میں انہیں متضاد اور باہم متصادم قوتوں کی کشمکش ہوتی ہے۔ چنانچہ فیضؔ کی انسانی دوستی کے حوالے سے گفتگو کرتے وقت یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ یہ کوئی تجریدی تصوّر نہیں ہے۔ وہ صرف ان انسانوں کے ساتھ ہیں جو مظلوم و مقہور ہیں اور ظلم اور قہر کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ البتہ وہ لوگ جو اس تمام فساد کی جڑ ہیں فیضؔ اُن کیلئے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے جب ہی تو وہ ظلم کا زہر گھولنے والوں کے لئے کھل کر اس جذبے کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل۔ وہ ذاتی طور پر شرافت اور بردباری کا پیکر تھے اور کبھی انھوں نے سنگ ہائے ملامت پر اپنا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ان کی اس شخصی خوبی سے اشفاق احمد نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ صوفیوں کے مسلک کے پیرو کار ہیں مگر فیضؔ اپنی انسان دوستی میں ہرگز غیر جانبدار نہیں رہے۔ وہ اس میں بالکل جانبدار ہیں اور انسانیت کے صرف اُس نصف کے ساتھ وابستہ ہیں جو حرص و ہوس سے آلودہ نہیں ہے۔ ان کی اس جانبداری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ زندگی کے ارتقائی عمل اور معاشرے کی اندرونی

کشمکش میں کون لوگ حیات آفریں قدروں کا ساتھ دے رہے ہیں اور زندگی کو زیادہ بامعنی بنانے میں مصروف ہیں اور دوسری طرف وہ کون لوگ ہیں جو اس عمل کو نقصان پہنچا رہے ہیں

فیض نے جس دور میں آنکھ کھولی تھی وہ انقلابی تبدیلیوں کا دور تھا۔ یہ دو عظیم جنگوں کے بیچ کا زمانہ تھا۔ ان جنگوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی موت نے سوچنے والے ذہنوں کو لمحۂ فکر فراہم کیا تھا۔ پھر اسی زمانے میں یورپ میں فاشزم کا طوفانِ بلاخیز اٹھا تھا جس نے جمہوریت دشمنی اور ملک گیری کی بدترین مثالیں قائم کی تھیں اسی دور میں سرمایہ دار ملکوں میں اقتصادی بحران کے نتیجے میں بے روزگاری اور بھوک و افلاس کے مسائل پیدا ہوئے تھے۔ برصغیر میں نوآبادیاتی تسلط کے خلاف جنگِ آزادی تیز ہو رہی تھی اور قومی خودمختاری کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا یہ سب عوامل فیض اور ان کی نسل کیلئے محرک ثابت ہوئے اور انہوں نے انسانی معاشرے کے حوالے سے سائنسی انداز میں سوچنا شروع کیا۔ ان کا یہی طرزِ فکر اور فلسفۂ حیات آخر عمر تک انکی شاعری کی پشتیبانی کرتا رہا۔ مسلکِ حیات کے اسی پرشوق تسلسل نے ان کی شاعری کو معنوی طور پر ایک اکائی کی شکل دے دی ہے۔ اسی لئے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کر ڈالا کہ ان کے یہاں تکرار کی کارفرمائی رہی ہے یا یہ کہ وہ ایک خاص مدت کے بعد جمود کا شکار ہو گئے تھے۔

فیض کے انسان دوستی کے تصور کو سمجھ کر ہی ہم اُن کی شاعری کے شعری محاسن سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور اُن کے فلسفۂ حیات کے پس منظر ہی میں اُن کی نغمائیت، اُن کا خوبصورت ڈکشن، اُن کے یہاں عشقیہ اور سیاسی موضوعات کا امتزاج اور انکی رجائیت وغیرہ صحیح معنوں میں ہم پر واضح ہوتی ہیں۔

فیض کے اسی تصورِ حیات سے انکا حب الوطنی کا تصور بھی وابستہ ہے۔ ان کے نزدیک اپنے وطن سے وابستگی یا وفاداری حکومتوں یا ان کے طفیلی اداروں سے وابستگی کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ نا ہی حب الوطنی کیلئے کسی دربار سے سند کی ضرورت ہے بلکہ حب الوطنی تو اپنے

ملک کے انسانوں سے محبت کا نام ہے اور اس حب الوطنی کی سند خود انسان کا ضمیر ہے ۔

اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ فیض کی شاعری ابنائے وطن سے محبت کی شاعری ہے انہوں نے اپنے اشعار میں اہل وطن کے دکھ درد کی تفسیر بڑے فنکارانہ پیرائے میں بیان کی ہے اگر انہیں مصائب میں مبتلا دیکھا ہے تو نجات کی نوید دی ہے، مایوسی میں گھرا پایا ہے تو ان کی آنکھوں میں کوئی صبح منور کر دی ہے، حالات سے مایوس ہو کر بے عمل ہوتے دیکھا ہے تو یہ پیغام دیا ہے کہ ؎

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ہر اہم موڑ پر، ہر بحران میں اور ہر اہم واقعہ پر فیض نے اپنا ردعمل ضرور شعر کے پیرہن میں پیش کیا ہے ۔ ان کے شعری سرمائے کا ایک بڑا حصہ ایام اسیری میں لکھا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد پہلے مسلم لیگی حکومتوں نے اور پھر فیلڈ مارشل ایوب خان کے مارشل لا نے انہیں زنداں کی زینت بنایا۔ یہ ایک فرد ہی کی ابتلا کا زمانہ نہیں تھا بلکہ دیکھا جائے تو سارا ملک ہی پابندِ سلاسل تھا۔ جبر کی فضا عام تھی اور ہر آزادی خواہ ہراساں کیا جا رہا تھا۔ اس دور میں فیض نے جو شاعری کی وہ زنداں نامہ، دستِ صبا اور دست تہہ سنگ میں یکجا ہے ۔ یہ شاعری کیا ہے ایک ظلم کے شکنجے میں جکڑی ہوئی قوم کی تاریخ ہے جسے ایک ایسے شخص نے زبان دی ہے جو صرف تاریک راہوں میں مارے جانے، اور شب کی رگ رگ میں لہو پھوٹنے، اور تیرگی کے امنڈتے چلے آنے، اور رات کی آہنی میت تلے دن کے دب جانے

کے ایلیے کو بیان نہیں کرتا بلکہ صبح پر لوگوں کے یقین کو زندہ بھی رکھتا ہے ۔

جا بجا لور نے اک جال سا بن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

یا

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے ، دل سے کہو نہ گھبرائے

ایوب خان کا دور ہماری تاریخ کا بڑا بھیانک دور ہے جب سامراج کی پروردہ حکومت نے شہری آزادیوں پر پابندیاں لگا دی تھیں ، سیاسی حقوق معطّل کر دیئے تھے اور جدید نو آبادیاتی نظام کے تحت ملک میں ایسی اقتصادی پالیسیوں پر عملدرآمد ہو رہا تھا جن کے نتیجے میں ایک مختصر سے طفیلی طبقے کے سوا عوام کی اکثریت افلاس کی سب سے نچلی سطح پر پہنچ چکی تھی ۔ پلاننگ کمیشن کے ماہرین اور ہارورڈ سے آنے والے مشیر اس افسوسناک تفاوت کو تیسری دنیا کی ترقی کے لئے ایک لازمی اور ناگزیر عمل قرار دیتے تھے ۔ اس دور میں عوام پر جو گذری اس کی عکاسی دستِ تہہ سنگ اور ، سر وادیٔ سینا ، میں بڑی تفصیل کے ساتھ ہوئی ہے ۔ فیضؔ کی نظم " انتساب " اس غم کا بہترین مرقع ہے جو اس پورے عہد میں طاری رہا ۔ ۱۹۶۴ء میں ایوب خان نے اپنی وردی پر لگے ہوئے بہت سے رنگ برنگے ستاروں کا رنگ اڑتا دیکھ کر گلاب کے انتخابی پھول کا سہارا لیا اور بنیادی جمہوریتوں کے خود ساختہ نظام کے ذریعے "بے مثال" کامیابی بھی حاصل کر لی ۔ یہ گویا جمہوریت کا مذاق اُڑانے کی بات تھی ۔ اس پر فیضؔ کا ردعمل کتنا پر اثر تھا ۔

زندان زنداں شورِ انا الحق ، محفل محفل قلقل مے
خونِ تمنا دریا دریا ، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رت پھولوں کی ، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے ، ماتم شہر بہ شہر

یا

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل
ہر ایک راہ گزر گردشِ اسیراں ہے
نہ سنگِ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

ہر ایک مردِ جواں مجرمِ رسن بہ گلو
ہر ایک حسینۂ رعنا، کنیزِ حلقہ بگوش
جو سائے دور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں
نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سبو
جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کھلتا، یہ پھول ہیں کہ لہو

۱۹۶۸ء میں ایوب خان کو عنانِ اقتدار سنبھالے ہوئے دس سال مکمل ہوئے۔ اس موقع پر ملک بھر میں دس سالہ جشن کا اہتمام کیا گیا۔ افسر شاہی، کنونشن مسلم لیگ اور سرکار نواز کاؤنسلروں کی مدد سے ملک کے قریے قریے میں جشن کی تقریبات منعقد کی گئیں۔ ان تقریبات میں ایوب خان کو قوم کے نجات دہندہ، ان کے فوجی کو دیتا کو انقلاب اور ان کی اقتصادی حکمت عملیوں کو اصلاحات کی حیثیت سے پیش کیا جاتا اور اس پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے، البتہ عوام کو ان تمام تقریبات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ تنگ دست تھے مگر ان کے لبوں پر مہر لگا دی گئی تھی اس طرح ملک کے قبرستان کا سکوت تو طاری کر دیا گیا تھا مگر زیرِ سطح جو طغیانی سر اٹھا رہی تھی اس کا سدباب نہیں کیا جا سکا۔

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکون ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

لیکن ابھی اس دس سالہ جشن میں ہونے والی تقریروں کی صدائے بازگشت ختم بھی نہیں ہوئی تھی اور پروپیگنڈہ لٹریچر کی سیاہی بھی نہیں مٹی تھی کہ ایوب خان کا راج سنگھاسن ڈانواڈول ہو گیا۔ ملک بھر میں عوامی مظاہرے شروع ہو گئے اور جمہوریت اور سماجی انصاف کے مطالبات زور پکڑنے لگے۔ امریکی یونیورسٹیوں کے وہ پروفیسر جنہوں نے ایوب خان کے نظام کو نو آزاد ممالک کیلئے مثالی اور قابلِ تقلید قرار دیا تھا اور خود ایوب خان کو ایشیائی ڈیگال کے خطاب سے نوازا تھا۔ سخت حیران تھے کہ یہ سارا نظام ریت کا گھروندا کیوں ثابت ہوا۔ جلد ہی ایوبی آمریت کا چہرہ بے نقاب ہو گیا، مگر انہوں نے ذرا ندامت محسوس نہیں کی اور جاتے جاتے خود اپنے دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اقتدار فوج کے حوالے کر کے رخصت ہو گئے۔ اب جنرل یحییٰ خان قوم کے "نجات دہندہ" تھے۔ جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء نے ہمارے قومی وجود پر جو ضربیں لگائیں اُن سے کون ناواقف ہو گا۔ یہ انہی کے دور میں ہوا کہ ملک کے اکثریتی صوبے کے جمہوری فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا اور اس کے احتجاج کو دبانے کیلئے گھناؤنی فوجی کارروائی کی گئی جو بالآخر ملک کے دولخت ہونے پر منتج ہوئی۔ اس پورے عرصے میں ملک کے مغربی حصے میں ایک عجیب ہیجان انگیز فضا تھی۔ آج ماضی کے اس سانحے کے حوالے سے شاید کوئی اپنے کردار کا اعتراف نہ کرے اور بڑے اعتماد سے قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے مگر قوم کا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہے کہ وہ یہ بھول جائے کہ وہ کون لوگ تھے جو مشرقی پاکستانی بھائیوں کو کافر قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کر رہے تھے اور پاکستان کے تحفظ اور اس کی "نظریاتی سرحدوں" کی حفاظت کے نام پر ملک کے اکثریتی صوبے کے سینے میں خنجر پیوست کر رہے تھے۔ اس پورے دور میں

اس خطے میں چند ایک آوازیں ہی ایسی اُٹھ پائیں جو اس سارے جنون کو سخت مہلک تصور کرتی اور ارباب اختیار کو اس سے باز رہنے کی تلقین کرتی تھیں۔ یہ آوازیں محب وطن اور جمہوریت پسند ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور صحافیوں کی آوازیں تھیں جو کمزور اور نزار ہونے کے باوجود اپنے فرض سے غافل نہیں رہیں۔ فیض کی آواز بھی ان آوازوں میں شامل تھی۔ افسوس کہ یہ آوازیں ہمارے حکمرانوں کے پاگل پن کو روک نہیں سکیں۔ مارچ اور اپریل ۱۹۷۱ء کے زمانے میں فیض نے جو دو تین نظمیں اور غزلیں لکھیں ان میں انکی مشہور نظمیں "حذر کرو مرے تن سے" اور "تہہ بہ تہہ دل کی کدورت" جیسی نظمیں شامل ہیں۔

یہ سب نظمیں "سروادی سینا" میں شامل ہیں جو ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک کی شاعری پر مشتمل ہے اس مجموعے کا آغاز "انتساب" سے ہوتا ہے جو عجیب و غریب نظم ہے۔ نظم کیا ہے ایک شہر آشوب کا نقشہ ہے جو ان سطروں پر ختم ہوتی ہے ؎

آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں

اس نظم کے آخر میں "ناتمام" لکھ دیا گیا ہے، یہ نظم مکمل ہوتے ہوئے بھی ناتمام شاید اس لئے ہے کہ اس کے بعد کی شاعری لفظوں کے بجائے عمل میں ہوتی ہے۔ یہ عمل شروع ہوا اور کارگر رہا تو نظم خود بخود مکمل ٹھہرے گی۔

"سروادی سینا" کے بعد فیض کے دو اور مجموعے "شام شہر یاراں" اور "مرے دل مرے مسافر" شائع ہوئے۔ ان میں بھی سیاسی حالات کے حوالے سے بہت سی نظمیں اور غزلیں موجود ہیں۔ "مرے دل مرے مسافر" کی زیادہ تر نظمیں انہوں نے بیرون ملک قیام کے دنوں میں لکھیں۔ ان میں بے وطنی کا احساس غالب ہے۔ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ فیض کو کسی نے ملک بدر نہیں کیا تھا اور وہ اپنی مرضی سے جلاوطن ہوئے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی شاعری پر بہت نچلی

سطح سے تنقید ہے ۔ ایک حساس انسان کے لیے جلاوطنی محض جغرافیائی دوری کا نام نہیں ہے فیض اگر اس مدت میں ملک میں بھی رہتے تب بھی احساس کی اس تپش میں کمی نہ ہوتی کیونکہ ملک کے اندر ہوں یا باہر اُن کا ذہنی رشتہ ہمیشہ اہلِ وطن کے ساتھ قائم رہا اور کون نہیں جانتا کہ اس دوران یہ اہلِ وطن، وطن میں جلاوطنی اور ملک میں ملک بدری کے کرب سے گزر رہے ہے ۔ اس دور میں ملک اپنی تاریخ کے تیسرے ملک گیر مارشل لا سے گزرا ۔ یہ مارشل لا نہ صرف اپنی طوالت میں بلکہ قوت میں بھی پچھلے مارشل لاؤں سے کہیں زیادہ تھا ۔ بقول فیض ؎

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے جو صید تھے اب صیاد ہوئے
پہلے بھی خزاں میں باغ اجڑے پر یوں نہیں جیسے اب کے برس
سارے بوٹے پتہ پتہ روش روش برباد ہوئے

فیض کی ساری زندگی اور پوری شاعری ایک آدرش کی جدوجہد ہے ۔ وہ جب تک زندہ رہے اس جدوجہد میں مصروف رہے ۔ آج وہ ہم میں موجود نہیں مگر انکا آدرش اب بھی زندہ ہے انکا وجود انسانیت دوست قوتوں کی بہت بڑی دولت تھا مگر ان کی شاعری بھی کچھ کم اہم سرمایہ نہیں ہے ۔ آج یہ احساس یقیناً ہمارے لیے بڑا سوہانِ روح ہے کہ ہمارے اجتماعی دکھوں کا مداوا کرنے والی اور ہمارے زخموں پر پیار کا مرہم رکھنے والی یہ مانوس آواز اب خاموش ہو چکی ہے مگر اس آواز کی صدائے بازگشت ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گی ، مشکلات میں ہمیں حوصلہ دے گی اور انقلاب پر ہمارے ایمان کو تازہ رکھے گی ۔ انقلاب جو انسان کا مقدر بھی ہے اور منزل بھی ۔

حوالہ جات

۱۔ مجنوں گورکھپوری، نقوش و افکار، (کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۶ء) ص ۵۸، ۵۹

۲۔ فیض احمد فیض، صلیبیں مرے دریچے میں، (کراچی: پاک پبلشرز لمیٹڈ)، ص ۲۲-۲۳

۳۔ رشید حسن خاں، فیض کی شاعری کے چند پہلو، مشمولہ: خلیق انجم (مرتب) فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء)، ص ۲۳۲

۴۔ فرانز فینن، افتادگانِ خاک (ترجمہ: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی)، (لاہور۔ نگارشات، ۱۹۶۹ء)، ص ۲۱

۵۔ اشفاق احمد، 'ملامتی صوفی'، مشمولہ: فیض احمد فیض، شامِ شہرِ یاراں، (لاہور: مکتبۂ کارواں) ص ۲۵-۲۶

* * *

برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات

مبارک علی

اگر ایک طرف تاریخ معاشرے میں شعور اور آگہی پیدا کرتی ہے تو دوسری جانب یہ تنگ نظری و عناد اور بے عملی کا بھی باعث ہوتی ہے۔ اس کا دارومدار تاریخ نویسی اور اس کے نظریات پر ہوتا ہے کہ کن حالات میں واقعات کو کس طرح کس انداز اور کن مفادات کے تحت پیش کیا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف طبقوں کے مفادات بدلتے رہتے ہیں اور ان مفادات کے زیر اثر تاریخ نویسی کے نظریات و انداز بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً مذہبی عقائد کے زیر اثر تاریخ کا الٰہیاتی نظریہ پیش کیا جاتا ہے اس نظریہ کے تحت تاریخ خدا کے منصوبوں کی تکمیل کرتی ہے۔ اس میں انسانی عقل و دانش کو کوئی دخل نہیں، وہ اس بساط عالم پر ایک مہرے کی مانند ہے جو کائنات میں خدا کے منصوبوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ تاریخ کے اس نظریہ کے تحت انسان کی حیثیت ایک بے جان کٹھ پتلی کی طرح ابھرتی ہے جو حالات کے بہاؤ کے ساتھ بغیر کسی جدوجہد اور مزاحمت کے بہتا چلا جا رہا ہے اور تاریخ میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ اس کی فہم و عقل سے بالاتر ہے۔ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ خود کو تقدیر کے حوالے کر دے اور تسلیم و رضا کا پیکر بن جائے۔

مذہبی عقائد کے حامل مورخین کی تاریخ نویسی میں مذہبی احیاء کا نظریہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ تاریخ کو اس معیار اور زاویہ سے جانچتے، اور پرکھتے ہیں۔ جو مذہب نے اپنے ابتدائی زمانے میں تشکیل دیئے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب کا ابتدائی دور کا معاشرہ مذہب کی خالص اور جاندار روایات کا حامل تھا۔ اس لیئے وہ ایک کامل اور مثالی معاشرہ تھا اور

اس لحاظ سے تاریخی عمل کی انتہا تھا۔ اس کے بعد سے تاریخ کے پاس سکھانے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ لہٰذا بعد کی تمام تبدیلیاں بدترین تبدیلیاں ہیں، اور ان کے مضر اثرات کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مذہب کی ابتدائی اور خالص روایات و اقدار کا احیا کیا جائے اور ترقی کی تمام علامت کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک معاشرے کی فلاح اس میں ہے کہ تاریخی عمل کو روک دیا جائے اور پھر واپسی کی جانب گردش ایام کو لوٹا دیا جائے، کیونکہ بقول شبلی نعمانی، ہماری ترقی اس میں ہے کہ ہم آگے کی طرف جانے کے بجائے، پیچھے کی جانب جائیں۔ اس نظریہ کے تحت لکھی جانے والی تاریخیں ماضی کی عظمت کو اجاگر کرتی ہیں اور ایسا کرتے وقت ان میں عقیدت اور والہانہ لگاؤ ہوتا ہے تنقیدی نقطۂ نظر اور تجزیہ نگاری نہیں ہوتی۔

احیا کے نظریہ کے برخلاف تاریخ میں ترقی کا نظریہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان برابر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے اور انسانی معاشرہ دور وحشت و بربریت سے ترقی کرتا ہوا۔ عقل و دانش اور خردمندی کے عہد تک پہنچ گیا ہے۔ یہ ترقی اس بات کی علامت ہے کہ انسان برابر آگے کی جانب بڑھے گا۔ جتنا وہ ترقی کرے گا، اتنا ہی اس کا ماضی اسے تاریک اور غیر مہذب نظر آتا رہے گا۔

یورپی اقوام کی صنعتی و فنی ترقی اور اس کے نتیجے میں نوآبادیاتی نظام تاریخ نویسی میں ایک اور تبدیلی لایا۔ ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں سیاسی اقتدار قائم کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنے عوام کو یہ تاثر دیا کہ چونکہ ان ملکوں میں مطلق العنانیت ہے اور ان کے حکمراں تمام ذرائع پیداوار پر قابض ہیں، اس لیے ان ملکوں کو فتح کر کے انہیں ظالم حکمرانوں سے نجات دلائی جائے۔ اور ان کی رعایا کو مہذب بنایا جائے۔ نوآبادیاتی دور میں تاریخ کا یہ سامراجی نظریہ یورپ میں بڑا مقبول رہا۔

جب نوآبادیات میں یورپی سامراج کے خلاف آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں تو

انہوں نے قومی نقطۂ نظر سے اپنی تاریخ کی جدید تشکیل شروع کی تاکہ اس کی مدد سے قومی جدوجہد کو تیز سے تیز تر کیا جائے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تاریخ نویسی میں بڑی تبدیلیاں آئیں، کیونکہ نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد ہر آزاد ملک نے اپنی تاریخ نئے سرے سے لکھنی شروع کی اور اقوام عالم میں باعزت مقام حاصل کرنے کے لیئے تاریخ سے مدد لی۔ اس سے "سفید اقوام کی تاریخ" کا غلبہ کمزور ہوا اور یہ تصور کہ عالمی تاریخ کا مرکز یورپ ہے وہ ختم ہوا اور ایشیا، افریقہ و لاطینی اقوام نے عالمی تاریخ کے مرکز اپنے ہاں تلاش کرنا شروع کر دیئے۔

لیکن قومی حکومتوں کے قائم ہونے کے بعد تاریخ نویسی کے رجحانات میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ نئے حکمران طبقوں اور اداروں نے تاریخ کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ اس کے تحت شخصیت پرستی اور حکومتی اداروں کی تعریف و توصیف تاریخ کا ایک اہم حصّہ بن گئے۔

مارکس اور اینگلز نے تاریخ کا جدلیاتی اور مادی نظریہ پیش کر کے تاریخی عمل کو سمجھنے میں مدد دی۔ اس کی روشنی میں انسانی تاریخ طبقاتی کش مکش اور جدوجہد کی تاریخ نظر آتی ہے جو ذرائع پیداوار اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے سبب برابر بدل رہی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس میں طبقاتی مفادات سیاست، قانون، معشیت اور ثقافت سب پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لیے اس نظریہ نے عوام کو تاریخ کا ایک ایسا شعور دیا کہ انہیں احساس ہوا کہ تاریخ میں صرف بادشاہوں، جاگیرداروں، امراء اور سرمایہ داروں کا تو ذکر ہے مگر ان کا نہیں۔ جب تک ان میں تاریخی شعور نہیں تھا، وہ یہی سمجھتے تھے کہ تاریخ بادشاہوں اور امرا کی ہوتی ہے لیکن اب وہ اس حقیقت سے واقف ہوئے کہ انہوں نے بھی تاریخ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لہٰذا ان کا بھی تذکرہ تاریخ میں آنا چاہیئے۔ ماضی میں چونکہ انہیں فراموش کر دیا گیا اور ان کے

تاریخی کردار اور عمل کی شہادتیں محفوظ نہیں رکھی گئیں، اس لئے ضروری ہے کہ اب انہیں تاریخ فراموش نہیں کرے' اور جدید تاریخ نویسی میں نہ صرف یہ کہ ماضی میں ان کا صحیح مقام انہیں دیا جائے۔ بلکہ موجودہ دور میں تاریخ ان کے تاریخی عمل کو محفوظ رکھے۔ کیونکہ تاریخ کی تشکیل میں اب بھی وہ اتنے ہی سرگرم عمل ہیں جتنے ماضی میں تھے۔

اس پس منظر کے بعد آیئے اب برصغیر ہندوستان کی تاریخ نویسی کا جائزہ لیا جائے۔ ہندوستان میں تاریخ نویسی کی ابتداء مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ہوئی۔ ہمارے ابتدائی دور کے مسلمان مؤرخوں نے تاریخ میں الہیاتی نظریہ کو اختیار کیا اور تاریخ میں جو کچھ ہوا اسے خدا کی طرف منسوب کرتے ہوئے واقعات کو من وعن تسلیم کر لیا۔ اس لیے ان کے ہاں تاریخ کا معاشی و سماجی نقطۂ نظر سے کوئی تجزیہ نہیں۔ سلاطین اور مغل بادشاہوں کے دور کے اکثر مورخین چونکہ مذہبی علماء و فقہا تھے۔ اس لئے انہوں نے بادشاہوں، امراء اور اہم شخصیتوں کے عمل اور کردار کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا، اور ان کی تعریف و توصیف کی جنہیں وہ مذہب کا پابند سمجھتے تھے۔ جو حکمران اِن کے نزدیک شریعت کے پابند نہیں تھے ان کے کردار اور طرز حکومت میں انہیں سوائے برائیوں کے اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اسی لئے ضیاالدین برنی نے علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق پر کڑی تنقید کی، اور عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے اعمال پر سخت گرفت کی، جب کہ التمش، ناصرالدین محمود، بلبن، فیروز شاہ تغلق، اور اورنگزیب نیک و خدا ترس اور صالح مسلمان قرار دیئے گئے۔

ان مورخین کے نزدیک تاریخ حکمرانوں، امراء، علماء، اور صوفیا کے کارناموں کی تاریخ ہے اس لئے انہوں نے یہ تاریخیں شخصیت پرستی کے نظریہ کے تحت لکھیں۔ اور بااثر و حکمران طبقوں کی شخصیتوں کو بڑے مبالغہ کے ساتھ پیش کیا تاکہ لوگ ان کے کردار، ان کی اصلاحات، اور ان کی خوبیوں سے متاثر ہوں۔ ضیاء الدین برنی اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:

"انبیاء، خلفاء، سلاطین اور بزرگان دین و دولت کے حالات و واقعات سے واقف ہونے کا نام تاریخ ہے۔ فن تاریخ کا مقصد خاص طور پر ان بزرگان دین و دولت کے حالات معلوم کرنا ہے۔ جو ذاتی کمالات رکھتے تھے۔ اور اپنی بزرگی کے باعث دنیا میں ناموری اور شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے برخلاف، ادنیٰ اور کم ظرف، نالائق، نااہل پست ہمت، گمنام، بے سروپا، کاہل، کم اصل اور بازاری لوگوں کو نہ تاریخ سے کوئی نسبت ہے۔ اور نہ اس کا مطالعہ ان کا شغل ہو سکتا ہے۔ تاریخ جاننے سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اور یہ علم کسی بھی وقت ان کے کسی کام نہ آئے گا۔ اس لیے تاریخ میں بزرگان دین و دولت کے اوصاف اور ان کی بزرگی و کمالات سے متعلق واقعات بیان کئے جاتے ہیں اور ادنیٰ، کم ظرف، کم اصل اور بازاری لوگوں کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ بخیل اور کم ظرف لوگوں کے لئے اس کا پڑھنا اور جاننا مضر ہے نہ کہ نفع بخش"۔ [1]

اس لیے یہ مورخین علم تاریخ کو صرف حکمران طبقوں کے لیے مفید سمجھتے تھے کہ جس کے ذریعے انہیں اچھے اور برے کی تمیز ہوتی ہے۔ اور وہ ماضی کے حوادثات و واقعات سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لیے تاریخ کا ایک اہم پہلو ان کے ہاں عبرت ہے جو حکمران طبقوں کے سامنے شخصیتوں و قوموں کے عروج و زوال اور بلندی و پستی کو مؤثر انداز میں پیش کرتی ہے۔

چونکہ ان میں اکثر مورخ دربار کے ملازم ہوتے تھے، اس لئے ان کی تاریخوں میں حکمرانوں اور امراء کی تعریف خوشامدانہ حد تک ہے۔ لہذا یہ تاریخیں نہ صرف واقعات کی یک رخی تصویر پیش کرتی ہیں، بلکہ یہ موضوعات کے اعتبار سے بھی محدود ہیں۔ ان میں صرف حکمرانوں اور امراء کی شخصیتیں ابھرتی ہیں اور ماضی کے تمام واقعات و حالات پر چھا جاتی ہیں، اور یہ تاثر دیتی ہیں کہ تاریخ صرف اہم شخصیتوں کے کارناموں کا دوسرا نام ہے۔

آخری عہد مغلیہ میں تاریخ نویسی میں انتہائی اہم تبدیلیاں آئیں۔ کیونکہ اس دور میں

مغل دربار کی طاقت و اہمیت کمزور ہو چکی تھی۔ اور مورخین جواب تک دربار کے ملازم تھے، اپنی ملازمتیں کھونے کے بعد تلاش معاش میں ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جا رہے تھے۔ اس کے نتائج یہ نکلے کہ ایک تو وہ دربار کے ملازم نہیں رہے، دوسرے بادشاہ کی سیاسی طاقت کی کمزوری کے بعد اب انہیں اس کی خوشامد کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے تاریخی واقعات کو بیان کرتے وقت وہ بادشاہ، امرأ، اور منصب داروں پر تنقید کرنے لگے۔ اس زور انتشار میں جبکہ ریاست و حکومت کے تمام ادارے ٹوٹ پھوٹ رہے تھے، تو اس کے ساتھ ہی حکومت اور مطلق العنان اداروں کی گرفت بھی کمزور ہو رہی ہے جس کی وجہ سے مورخ نے خود کو پہلی مرتبہ ذہنی طور پر آزاد محسوس کیا اور اس ذہنی آزادی کے ساتھ اس نے واقعات و حالات کو قلم بند کیا۔ ان کی جھلک ہمیں اس عہد کی تاریخ نویسی میں ملتی ہے۔ تاریخ، دربار، حکمران اور سیاست کی حدود سے بڑھ کر اب اس دور کی سماجی و معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں کا بھی تذکرہ کرنے لگی۔ اس کی مثال مرشد قلی خان کی "مرقع دہلی" اور آنند رام کا سفر نامہ ہے، جن میں ہندوستانی معاشرہ کی سماجی و ثقافتی سرگرمیاں، اور عام حالات بڑی خوبصورتی سے پیش کیے گئے ہیں۔

اس عہد کی تاریخ نویسی میں دورِ زوال کی اداسیاں، مایوسیاں، اور سیاسی انتشار پوری طرح جھلکتا نظر آتا ہے اور مورخوں کی تاریخوں کے اکثر نام "عبرت نامہ" سے شروع ہوتے ہیں۔ معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ اور زوال کے عمل کو سمجھنے کے لیے یہ تاریخیں بڑی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

مغل دربار کی مرکزی حیثیت ختم ہونے کے بعد ہندوستان میں جگہ جگہ خودمختار ریاستیں قائم ہوئیں اور ان کے حکمرانوں نے اپنے خاندان اور ریاست کی تاریخیں لکھوائیں تاکہ ان کے خاندان کی عظمت ثابت کر کے ان کی حکمرانی کا جواز پیدا کیا جائے اور رعیت میں

ان کے لئے عزت واحترام کے جذبات پیدا کئے جائیں۔ اسی دوران ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی ہندوستانی مورخین سے تاریخیں لکھوائیں، جن میں ہندوستان کی ریاستوں کی انتظامی ابتری، اور ان کے حکمرانوں کی نااہلی کو بیان کیا گیا ہے، تاکہ تاریخ کا یہ نظریہ کمپنی کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو جائز ثابت کرے۔ اس دور کی تاریخ نویسی میں یہ دو متضاد نظریے دو طاقتوں، اور دو طبقوں کے مفادات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

اس عہد میں تاریخ نویسی میں ایک اور تبدیلی اس وقت آئی جب مغل جاگیردار اور امرأ بادشاہ کی سیاسی طاقت کے خاتمہ اور دربار کی کمزوری کے بعد دارالحکومت اور بڑے شہروں کے بجائے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں آباد ہوئے اور یہاں انہوں نے شاعروں ادیبوں اور مورخوں کی سرپرستی کی۔ ان کی سرپرستی میں اس عہد میں چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں کی تاریخیں لکھی گئیں جس کی وجہ سے تاریخ نویسی میں مختلف جہتیں آئیں؛ اور تاریخ کا دائرہ پہلے سے اور زیادہ وسیع ہو گیا۔

ہندوستان کی تاریخ نویسی میں ایک بڑی تبدیلی ہم برطانوی اقتدار کے بعد دیکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خاص مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کی تاریخ کو نئے سرے سے تشکیل کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو درست اور جائز ثابت کرنے کے لئے تاریخ سے مدد لی جائے۔ اس مقصد کے تحت ہندوستان کے ماضی کی تاریک تصویر پیش کی گئی۔ اور یہ ثابت کیا گیا کہ عالمی تہذیبوں کے مقابلے میں ہندوستان کی زیادہ اہمیت نہیں؛ اور سیاسی و معاشی و معاشرتی اور جغرافیائی حالات کی بناپر ہندوستان کا یہ مقصد رہا ہے کہ وہ غیر ملکی طاقتوں کے زیر نگیں رہے۔

انہوں نے ہندوستان کی تاریخ ہندو اور مسلم ادوار میں تقسیم کر کے تاریخ میں فرقہ وارانہ و مذہبی نقطۂ نظر کو داخل کیا، مزید یہ کہ ہندوستان میں بسنے والی اقوام کو نسلی مذہبی اور جغرافیائی لحاظ سے تقسیم کر کے ان میں اختلافات

پیدا کئے۔ بعض کو شورش پسند اور باغی، بعض کو لالچی و کینہ پرور، بعض کو لٹیرے وڈاکو ثابت کر کے ہندوستان کی اقوام کو اخلاقی لحاظ سے پست اور رذیل ثابت کیا تاکہ سفید اقوام کی برتری مستحکم ہو۔

اس کے ساتھ ہی برطانوی حکمراں طبقوں کو اس کی بھی ضرورت تھی کہ وہ ہندوستانی نظام سے جو انہیں ورثہ میں ملا تھا، اس کی حقیقت وماہیت سے واقف ہوتے۔ اس لئے انہوں نے خصوصیت سے فارسی ماخذوں اور زبانی روایات کی مدد سے ابتدائی تاریخیں تیار کرائیں۔ اکثر فارسی کی تاریخی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کرایا۔ اگرچہ یہ تاریخی کتابیں کئی کمزوریوں کا شکار ہیں، مثلاً فارسی سے ناواقفیت کی وجہ سے واقعات کو غلط سمجھنا اور اور تاریخ لکھتے وقت متعصبانہ ذہن رکھنا وغیرہ۔ اس لیے انہوں نے تاریخ سے جو نتائج اخذ کیئے وہ صحیح نہیں تھے۔ لیکن ان تاریخوں کا ایک اثر یہ ہوا کہ اس سے تعلیم یافتہ طبقے میں تاریخ کا شوق بیدار ہوا۔ اور یہ احساس بیدار ہوا کہ اپنی تاریخ کو، قومی امنگوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے سرے سے تشکیل دیا جائے۔

لہذا انہیں تاریخوں کے رد عمل کے طور پر ہندوستانی مورخین نے تاریخ میں قومی نقطۂ نظر کو استعمال کیا؛ اور اس کے ذریعے آگے چل کر سیاسی جدوجہد میں برطانوی سامراج سے نظریات کی جنگ لڑی۔ تاریخ کے سامراجی نقطۂ نظر کے خلاف انہوں نے قدیم ماخذوں کو کھنگال کر اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کی تہذیب سب سے زیادہ قدیم ہے اور ہندو فلسفہ، مذہب اور ادب اعلیٰ اقدار کا حامل ہے۔ زمانہ قدیم میں ہندوستان میں نہ صرف جمہوریت تھی، بلکہ یہ سائنس اور صنعت میں بھی انتہائی ترقی یافتہ تھا۔ اس لئے ہندوستان کی تہذیب سے دوسری تمام تہذیبوں نے سیکھا ہے موہن جودڑو کی دریافت کے بعد سے ہندوستانی تہذیب کی قدامت ثابت ہوگئی؛ اور ہندوستانی بھی، بابل، اسیریا، مصر، یونان، اور روم کی تہذیبوں کے مقابلہ پر آگیا۔ اس لیئے ہندوستانی مورخوں نے آثار قدیمہ

کی دریانتوں کو تاریخی مواد میں استعمال کرکے مبالغہ کی حد تک ماضی کی تصویر کشی کی۔

قومی جدوجہد کا یہی دور تھا جب ہندوستانی مورخین نے نہ صرف قدیم ہندوستان کی شاندار تصویر پیش کی، بلکہ مسلمانوں کے عہد کی عظمت کو بھی ابھارا اور اس نظریہ کو آگے بڑھایا کہ سلاطین و مغل حکمران متعصب اور مذہبی تشدد کے حامل حکمران نہیں تھے بلکہ انہوں نے ہندوستان کی ہندو و مسلم رعیت کے ساتھ یکساں سلوک کیا اور ان کے عہد میں ہندوستان نے تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے بہت ترقی کی۔ اس قومی نقطۂ نظر سے انہوں نے برطانوی اقتدار اور اس کی کامیابیوں کو اس طرح پیش کیا کہ معاشی و سیاسی و معاشرتی حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے کے بجائے انہیں انگریزوں کی چالاکی، دھوکہ بازی، اور فریب سے منسوب کر دیا۔ چونکہ انگریز مورخین نے ریاستوں کے حکمرانوں کو نالائق اور عیاش بتایا تھا، اس لئے قومی نقطۂ نظر سے لکھنے والوں نے انہیں ہیرو اور مظلوم بنا کر پیش کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تاریخی عمل میں جو نظریاتی عوامل کام کر رہے تھے، ان کو اجاگر کرنے کی اور سامنے لانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ مثلاً انگریزوں کی فتوحات کو چند اشخاص کی غداری سے تعبیر کیا گیا۔ میر جعفر، میر صادق، اور تاؤمل کی انگریزوں سے حمایت کو ان کی بنگال، میسور، اور سندھ کی فتح قرار دیا۔ جبکہ اس پس منظر کا تجزیہ نہیں کیا گیا کہ ان لوگوں نے کیوں غداری کی؟ اور وہ کون سے عوامل تھے کہ جن کی وجہ سے ہندوستان کے حکمران طبقوں میں غدار پیدا ہو رہے تھے؟

ہندوستان میں سیاسی جدوجہد اور آگے بڑھی تو اس خیال سے کہ انگریزوں کے بعد اقتدار کس کو منتقل ہوگا، ہندوؤں میں احیائی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان تحریکوں کے پس منظر میں مذہبی تعصب، جنون اور فرقہ وارانہ جذبات کارفرما تھے۔ لہٰذا ہندوؤں کو متحد کرنے کے لئے انہوں نے قدیم ہندوستان کی تاریخ کی تشکیل کا کام شروع کیا، ساتھ ہی مسلمانوں کے عہد حکومت کو تنقید کا ہدف بنایا گیا اور خصوصیت سے تاریخ کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا شروع کیا گیا، جن سے مسلمانوں کے ظلم و ستم کو زیادہ سے زیادہ بیان کیا جائے۔ ان

شخصیتوں کو ابھارا گیا، جنہوں نے مسلمان حکمرانوں سے جنگیں لڑیں، اس کے نتیجہ میں رانا پرتاب سنگھ اور شیواجی ہندو قوم کے ہیرو بن کر ابھرے۔ اس مرحلے پر ہندوستان کی تاریخ نویسی میں فرقہ ورانہ جذبات بڑی شدت کے ساتھ آئے۔ اس فضا میں ان مورخین کو انتہائی دشواری کا سامنا کرنا پڑا جو تاریخ کو معروضی انداز میں لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ڈانگے لکھتا ہے کہ:

"عمرانی نقطہ نظر سے قدیم روایات کی جانچ پڑتال کو رجعت پسند ہندو اور ہندوستانی بورژوا (ہندو و مسلمان) نے روکنے کی کوشش کی کیونکہ اس تحقیق کے ذریعہ کچھ ایسے حقائق سامنے آتے تھے جو ان کی موجودہ اخلاقیات پر کاری ضرب لگاتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ان کو تاریخ کا ایک حصہ بنانے پر سخت اعتراضات کیے وہ اس "شرم" کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اس قسم کی چیزیں بھی تاریخ کا حصہ تھیں۔"

جب مشہور مورخ راجواڈے RAJWADE نے ہندو خاندان اور شادی پر کام کرنا شروع کیا تو اس کے خلاف مرہٹی پریس میں زبردست ہنگامہ ہوا۔ اور آخر ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ وہ یہ کام پورا نہیں کر سکا۔ یہی حال جے ساول JAYSAWAL کا ہوا کہ اس کا پورا کا پورا مسودہ ضائع کر دیا گیا۔ ۳۲؎ اسی ماحول میں جب پروفیسر حبیب نے محمود غزنوی پر اپنی مشہور کتاب لکھی تو ان کے خلاف مسلمانوں نے شدت کے ساتھ تنقید کی۔ فرقہ ورانہ جذبات کے زیر اثر جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں تاریخ کو معروضی انداز کے بجائے مذہبی نفرت کے تحت لکھا جانے لگا، اور تاریخ کو اس نفرت کے پھیلانے میں استعمال کیا جانے لگا۔ مثلاً جادوناتھ سرکار نے اورنگ زیب اور شیواجی پر جب کتابیں لکھیں تو اس کے جواب میں فاروقی نے اورنگ زیب کی حمایت میں کتاب لکھی اور تفضل داؤد نے اصلی سیواجی REAL SEWAJI لکھ کر اس پر سخت تنقید کی۔ اس کے بعد سے ہندوستانی تاریخ نویسی میں فرقہ ورانہ نفرت ایک اہم عنصر بن گئی ہے جس سے اب تک ہماری تاریخ آزاد نہیں ہو سکی ہے۔

ہندو مورخین نے جب قدیم ہندوستان کی تاریخ کی تشکیل کی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ انہوں نے قدیم ہندوستانی ماضی اور اس کی تہذیبی و ثقافتی عظمت و بلندی کو اپنے لیے خطرہ سمجھا۔ اس لیے اس کے ردعمل میں مسلمان مورخین نے قدیم اسلامی تاریخ کی تشکیل کی طرف توجہ دی اور اس کی شان و شوکت میں انہوں نے اپنا تشخص تلاش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ شبلی نعمانی، عبدالرزاق کانپوری اور دوسرے مسلمان مورخین نے اسلامی تاریخ کی عظمت اور مسلمان حکمرانوں، سیاستدانوں، ادیبوں اور علماء کی تاریخیں لکھ کر ان کے کارناموں سے لوگوں کو روشناس کرایا۔

اسلامی تاریخ سے دلچسپی اس لیے اور بھی زیادہ بڑھی کہ انگریز مورخین نے اسلام پر اعتراض کرنا شروع کر دیئے تھے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ مسلمان، ان کا مذہب اور ان کی تاریخ کمتر درجہ پر ہیں۔ یہ نقطۂ نظر ان کے سامراجی عزائم کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھا۔ اس صورتحال میں سرسید نے سیرۃ رسول اللہ پر یورپی مورخوں کے اعتراضات کا جواب دیا۔ پھر یہ کام شبلی نعمانی اور امیر علی نے پورا کیا۔ اسلامی تاریخ کے شوق نے اور اسلامی عظمت کے تذکروں نے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری جڑیں ہندوستان سے اکھاڑ کر پھینک دیں، اور ان میں پان اسلام ازم اور امت مسلمہ کے خیالات پہلے سے زیادہ مستحکم ہو گئے۔ اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ انہیں ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے عہد سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں رہی کیونکہ اسلام کی تاریخ میں انہیں جو شان و شوکت، اور خیرہ کن جگمگاہٹ نظر آ رہی تھی، وہ ان کے نزدیک عہد سلاطین و عہد مغلیہ میں نہیں تھی۔ ان کے خیال میں دہلی و لاہور، آگرہ و فتح پور سیکری، دمشق، بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کی ہمسری نہیں کر سکتے تھے یہی وجہ تھی کہ شبلی نعمانی مورخ اسلام ہندوستان کی تاریخ سے اس حد تک ناواقف تھے کہ انہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ گلبدن بیگم کون تھی اور اس نے کونسی تاریخی کتاب لکھی تھی۔ [۴۲]

سرسید نے اپنی مخصوص فکر کے ساتھ پیغمبر اسلام پر اعتراضات کا تو جواب دیا، مگر وہ

یاں اسلام ازم کے تصور کے خلاف تھے کیونکہ یہ برطانوی حکومت کے مفاد میں نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ میں دلچسپی لی اور تاریخ فیروز شاہی، آئین اکبری، اور توزک جہانگیری، جیسی اہم کتابوں کو تصحیح کے بعد شائع کرایا۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہمارے تعلیمی اداروں کے نصاب میں تاریخ کا مضمون شامل نہیں ہوتا تھا۔ اگر تھوڑی بہت تاریخ پڑھائی بھی جاتی تھی تو وہ ابتدائی اسلامی تاریخ تھی۔ ہندوستان کی تاریخ نصاب کا حصہ نہیں تھی۔ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ سے عدم دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے ہاں "عرب تاریخ" کو "اسلامی تاریخ" سمجھا گیا۔ عہد عباسیہ کے بعد کی تاریخ چونکہ عربوں کی تاریخ نہیں، اسے لئے اسے ترکوں، ایرانیوں، مغلوں اور بربروں کی تاریخ کہا گیا۔ بعد میں جب تاریخ میں فرقہ وارانہ نقطہ نظر آیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ تاریخ کے ذریعے ہندوؤں پر اپنی برتری ثابت کریں اور خود اپنا حکمراں نسل سے تعلق بتائیں، تو اس وقت ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ سے ان میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

آزادی کے بعد تاریخ نویسی کے جو رجحانات ہمارے ورثہ میں آئے، ان میں خصوصیت سے مذہبی اور فرقہ وارانہ نظریات انتہائی قوی ہیں۔ کیونکہ پاکستان کے قیام کے بعد سے حکمراں طبقوں کی سیاست میں مذہب اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اسی لئے تاریخ کی مذہبی اور فرقہ وارانہ تعبیر و تفسیر ان حکمراں طبقوں کو مزید زندگی دے رہی ہے۔

اس نظریہ کے تحت تاریخ لکھنے والوں کا موقف یہ ہے کہ برصغیر ہندوستان و پاکستان کی تاریخ کی ابتداء مسلمانوں کی آمد سے کرنا چاہئیے کیونکہ اس سے پہلے کی تاریخ ان کے لئے فضول ہے۔ کیونکہ قدیم ہندوستانی تاریخ کا اسلامی روایات، عقائد اور ثقافت سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے اس تاریخ کی تشکیل مسلم معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہوگی۔ اس نقطہ نظر کے ماننے والے جن میں جذبات کی شدت ہے وہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ موئن جو دڑو، ہڑپہ اور گندھارا کے

تمام آثار کو بالکل ختم کر دینا چاہئے کیونکہ ان کا تعلق دورِ جاہلیت و وحشت سے ہے اور اسلامی معاشرے کے قائم ہونے کے بعد ان پر فخر و مباہات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے اسی نقطۂ نظر کے تحت یہ قدیم ہندوستان کی تاریخ، مذہب، فلسفہ اور ثقافت میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔

لہٰذا اس نقطۂ نظر سے تاریخ لکھنے والوں کی کوشش ہے کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کو اسلامی تاریخ سے ملا دیا جائے۔ تاکہ برصغیر کی مسلم ثقافت کی جڑیں عربی تہذیب و تمدن اور ثقافت سے مل جائیں۔ اس طرح ان کا رشتہ ہندوستان سے کٹ کر عرب و ایران سے قائم ہو جائے۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کو اسلامی ثابت کرنے کے لئے ان کی سیاسی فتوحات کو جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان کا معاشی و معاشرتی تجزیہ نہیں کیا جاتا۔ اس کے نتیجہ میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد سے سندھ "باب الاسلام" بن گیا یہی صورتحال محمود غزنوی اور معزالدین غوری کی ہے کہ ان کی فتوحات کو اب ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کی وجہ بتایا جاتا ہے اور یہ مسلمان حکمران مذہبی نقطۂ نظر سے مجاہد، غازی اور بت شکن کے القابات سے نوازے جاتے ہیں۔

ہندوستان کی فرقہ ورانہ فضا میں تاریخ نویسی کا یہ نقطۂ نظر بڑا مقبول ہوا اور عام مسلمان ان سلاطین و شہنشاہوں کے کارنامے پڑھ کر جوش و مسرت سے دوچار ہوا اور ان کی شان و شوکت اور جاہ و جلال نے اس میں فخر اور بڑائی کے جذبات پیدا ہوئے۔

حکمرانوں اور امرائ کے کارناموں کے ساتھ ساتھ، ہمارے مورخین نے علمأ اور صوفیأ کے تذکرے بھی لکھے ہیں جن میں ان کے افکار، ان کے اثرات اور ان کی شخصیتوں کو ابھارا ہے: یہ تذکرے بھی عقیدت کے تحت لکھے گئے ہیں۔ اور ان میں تنقیدی انداز اختیار نہیں کیا گیا۔

تاریخ نویسی میں یہ رجحانات ہمارے معاشرے میں حکمران طبقوں کے اقتدار کو

مستحکم کر رہے ہیں۔ کیونکہ جن طبقوں کی ماضی کی عظمت کو ابھارا جا رہا ہے وہ حکمران طبقوں کا ماضی ہے عوام کا نہیں۔ اس لئے ان کے ماضی کی شان و شوکت، فارغ البالی، خوش حالی اور دولت کی فراوانی کے تذکروں سے ان طبقوں میں اعتماد پیدا ہو رہا ہے اور تاریخ کا یہ نظریہ تشہیر پا رہا ہے کہ شخصیتیں تاریخ ساز ہوتی ہیں عوام نہیں۔ اس لئے ماضی کی عظمت کی یہ محدود تصویر عام لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ عام مسلمان اس ماضی پر کیوں فخر کرے جس میں اس کا کوئی حصّہ نظر نہیں آتا یا جس کی تشکیل میں اس نے کوئی کام نہیں کیا ہو۔ اس لیے جب ماضی کے احیاء کی بات ہو، اور اس کا پرچار کیا جائے تو ایک عام مسلمان کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ اگر وہ سنہری دور لوٹ آیا تو کیا اس میں اس کے لئے بھی کوئی باعزت مقام ہے کیونکہ ایک طبقاتی معاشرے کے احیا میں صرف اعلیٰ طبقوں کو فائدہ ہوگا اور نچلے طبقے ماضی کی طرح ذلت و خواری کی زندگی بسر کریں گے۔

تاریخ نویسی کے یہ نظریات عوام کی حیثیت کو کمزور کر کے ان میں احساس کمتری پیدا کر رہے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں اس کے مطالعے کے بعد یہ خیال راسخ ہو جاتا ہے کہ ان کی بہتری کے ذمہ دار حکمران، علماء اور صوفیا کی شخصیتیں ہیں جو اصلاحات، عدل پسند اور نیک دلی کے ساتھ ان کی حالت کو سدھار دیں گے۔ اس وجہ سے ان کا اپنا اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے حقوق کے لیے کوئی جنگ نہیں کرتے اور جمہوریت کے بجائے انہیں آمرانہ طرز حکومت میں اپنے مسائل کا حل نظر آتا ہے۔ اب بھی وہ اپنے حکمرانوں کی شان و شوکت، اعلیٰ خاندان، شرافت، اعلیٰ نسبی اور دولت سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور ان میں انہیں ماضی کے حکمرانوں کی عظمت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ طبقاتی تقسیم کی سچائی ان کے ذہنوں پر اس قدر غالب ہے کہ وہ اسے فطری اور قدرت کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ ہماری تاریخ نے ان خیالات و نظریات کے پرچار کے ذریعے عوام کو ذلت کی گہرائیوں میں ڈال کر ان کی امنگوں، ولولوں، اور خواہشات کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

اس مطالعہ سے یہ بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ تاریخ نویسی کے یہ رجحانات

ہمارے معاشرے کے طبقاتی مفادات کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان طبقوں کے مفادات کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی ہوئی، مگر انھوں نے کسی بھی مرحلہ پر عوامی شعور میں نہ تو اضافہ کیا اور نہ اسے پختہ کیا، بلکہ عوامی شعور اور آگہی کو روکا گیا۔ مثلاً سلاطین و مغل بادشاہوں کے مورخوں نے حکمرانوں اور امرا کے مفادات کو ذہن میں رکھتے ہوئے تاریخ لکھی۔ تو انگریزی عہد کے مورخوں نے سامراج اور ان کے حمایتی جاگیرداروں کی حمایت کی؛ اور آزادی کے بعد سے ہمارے مورخ حکمران طبقوں کے مفادات اور نظریات کے سانچہ میں تاریخ کو ڈھالنے کا کام کر رہے ہیں تاکہ جبر و استبداد کے ادارے اور استحصالی طبقے قائم و دائم رہیں۔

ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کو ان طبقاتی مفادات کی زنجیروں سے آزاد کرایا جائے اور اسے تنگ اور محدود دائرے سے نکال کر وسیع اور کھلی فضا میں لایا جائے۔ تاکہ اس کے ذریعہ سوئے ہوئے عوامی شعور کو بیدار کیا جائے۔ اور تاریخ میں ان کی جڑیں تلاش کر کے انہیں بھی ایسی یادداشتیں دی جائیں۔ جو ان میں عزت و وقار کے جذبات پیدا کریں کیونکہ اپنی تاریخی یادداشتیں معاشرے کے تمام طبقوں کی نہیں بلکہ صرف حکمران طبقوں کی ہیں۔ عوام کی اگر کوئی تاریخی یادداشتیں ہیں بھی تو ان میں سوائے مایوسی، اداسی، اور ذلت و حقارت کے کچھ نہیں۔ اس لئے تاریخ نے اگر عوام کو ماضی میں کوئی باعزت مقام نہیں دیا۔ تو وہ بغیر ماضی کے کھوکھلی زندگی گذارنے پر مجبور ہو جائیں گے؛ اور ان سے توقع نہیں کی جا سکے گی کہ وہ اپنے حقوق کے لیئے جابرانہ و آمرانہ حکومتوں سے جنگ کر سکیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ تاریخ کی جدلیاتی اور طبقاتی نقطۂ نظر سے تعبیر و تفسیر کی جائے اور تاریخی واقعات کے پس منظر میں طبقاتی مفادات کی نشاندہی کر کے ان کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا جائے۔ تاریخ کے اس عمل سے استحصالی طبقوں کی صحیح تصویر عوام کے سامنے آئے گی اور یہی تاریخ کی وہ تفسیر ہوگی جو ان میں شعور و آگہی پیدا کرے گی۔

حوالہ جات

۱ ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) لاہور ۱۹۶۹ء ص ۴۷۔۴۸

2. S.A.DANGE; INDIA: FROM PRIMITIVE COMMUNISM TO SLAVERY, 6th EDITION, 1979, P.20

۳۔ ایضاً۔ ص۔ ۲۰

۴۔ جب علی گڑھ کالج کے پرنسپل نے گلبدن بیگم کے بارے میں شبلی سے معلومات حاصل کیں تو انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ بعد میں انہوں نے گلبدن بیگم کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور مختصر مضمون لکھا۔ حوالے کے لئے دیکھئے، شیخ محمد اکرام یادگار شبلی۔ لاہور۔ ۱۹۷۱۔ ص ۱۶۵

* * *

عالمی مزدور تحریک

ندیم خالد

دوسری قسط

پہلی جنگ عظیم کی طرح یہ جنگ بھی سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار تھی اور اس کے آغاز کا سبب یہ تھا کہ سامراجی ریاستوں کے درمیان تضادات اپنے عروج کو پہنچ گئے تھے۔ جارحیت پرست فاشسٹ بلاک یعنی جرمنی، اٹلی اور جاپان نے دنیا کو بزور طاقت از سرِ نو تقسیم کرنے کے پروگرام پر عمل درآمد شروع کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُن کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے اور اُن کی حق تلفی ہوئی ہے۔ اس بلاک کو مغربی طاقتوں کے اتحاد یعنی برطانیہ، فرانس اور امریکہ کا سامنا کرنا پڑا جنہوں نے پہلی جنگ عظیم میں فتح یاب ہو کر اپنی مرضی کے مطابق دنیا کا بٹوارہ کر لیا تھا اور اب ان کا ارادہ اپنے مقبوضات اور دائرہ اثر کو برقرار رکھتے ہوئے مزید بڑھانے کا تھا۔

دوسری جنگ عظیم نوع انسانی کی سب سے زیادہ تباہ کن جنگ تھی۔ یہ جنگ چھ سال چلی اور اس میں روئے زمین کی تقریباً سبھی قومیں شریک تھیں۔ اس جنگ میں ۵ کروڑ لوگ جان سے مارے گئے اور ساڑھے تین کروڑ زخمی ہوئے یا اپاہج ہو گئے۔

جنگ کے آغاز میں برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے سامراجی حلقوں نے عسکریت پرست جرمنی کی مدد اس اُمید پر کی تھی کہ جارحیت کا رُخ مشرق کی جانب، سوویت یونین کے خلاف ہوگا۔ لیکن واقعتاً یہ ہوا کہ سامراجی طاقتوں کے درمیان تضادات اُن تضادات سے زیادہ شدید ثابت ہوئے جو سامراجی طاقتوں اور دنیا کی پہلی مزدور ریاست کے درمیان تھے۔ چنانچہ جب جنگ چھڑی تو دونوں فریق ایک سامراجی جنگ لڑ رہے

تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ جنگ نے ایک اور صورت اختیار کرنی شروع کی۔ جب جرمن ایک کے بعد ایک ملک فتح کرتے چلے گئے اور جب انہوں نے ان ملکوں میں ساری بورژوا جمہوری آزادیوں کو ختم کر دیا اور وہاں خون آشام دہشت کی حکمرانیاں قائم کر دیں تو ان ملکوں کی قومیں اپنے فاتحوں کی مزاحمت کرنے کے لئے مجتمع ہوئیں اور رفتہ رفتہ اس جنگ نے ایک فاشسٹ دشمن جنگ آزادی کی نوعیت اختیار کر لی۔

۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ ہٹلر کے نزدیک سوویت یونین کے خلاف جنگ کا مقصد پرولتاری اقتدار کا خاتمہ اور اس کے وسائل پر قبضہ کر کے بورژوا زمیندار حکمرانی کا دوبارہ قیام تھا۔ جنگ کے ابتدائی دور میں جرمنی بعض محاذوں پر برتری حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ لڑائی کے محاذ پر جو ناکامیاں ہوئیں انہوں نے مزدوروں اور کسانوں اور سوویت یونین کی متعدد قوموں کے درمیان قریبی رشتوں کو کمزور کرنا تو درکنار اور بھی مضبوط بنا دیا۔ سرخ فوج کا حوصلہ نازی فوجوں سے کہیں زیادہ بلند تھا اس لئے کہ وہ آزادی کے لئے ایک منصفانہ جنگ لڑ رہے تھے اور جنگ کے بلند مقاصد کا احساس سوویت مجاہدوں کو دلیری کے بے مثال کارناموں پر آمادہ کرتا تھا۔

جنگ کے آغاز میں ٹراٹسکی وادی یہ پیش گوئی کر چکے تھے کہ سوویت یونین کے محنت کش عوام اسٹالن کے مظالم سے اس قدر متنفر ہو چکے ہیں کہ وہ اس جنگ میں جھونکے جانے پر تیار نہیں ہوں گے۔ لیکن واقعات نے ثابت کیا کہ سوویت محنت کشوں کے لئے سوشلسٹ حاصلات کا دفاع کس قدر شدید اہمیت کا حامل تھا۔ لاکھوں مزدوروں نے فوجی فرائض کے لئے اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کیں۔

سوویت جرمن محاذ پر جیسے ہی لڑائی شروع ہوئی ویسے ہی ساری دنیا کے لوگوں نے سوویت یونین کی پرزور حمایت میں آواز بلند کی چونکہ وہ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ سوویت یونین ہی وہ واحد طاقت ہے جو جرمن جنگی مشین کو چکنا چور کر سکتی ہے اور عالمی

تہذیب کو نازی وحشیوں سے بچا سکتی ہے۔ لیکن ماضی کی طرح اب بھی مغرب کی سامراجی بورژوازی ایسے مقاصد کے درپے تھی جو آزادی کے اُن آدرشوں سے کوسوں دور تھے جنہوں نے فاشزم کے خلاف لڑنے والی قوموں کو حوصلہ اور ہمت عطا کیا تھا۔ امریکی اور برطانوی بورژوازی کے رجعت پسند حلقے اپنی اس اُمید کو ذرا برابر بھی نہیں چھپاتے تھے کہ سوویت یونین اور جرمنی کے درمیان جنگ دونوں فریقوں کو کمزور کر دے گی اور اس طرح جنگ کے بعد کی دنیا میں انگریز امریکی غلبے کے لئے سازگار صورتحال پیدا ہو جائے گی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی حکومتیں یورپ میں ایک دوسرا محاذ کھولنے کو برابر ٹالتی رہیں اور اس طرح سوویت فوج کا بار بڑھاتی رہیں۔ دوسرا محاذ بالآخر ۱۹۴۴ء کی گرمیوں میں اُس وقت کھولا گیا جب سُرخ فوج کی عظیم الشان کامیابیوں نے فتح کو یقینی بنا دیا تھا اور جب انگریز امریکی فوجیں فرانسیسی ساحل پر اُترنی شروع ہوئیں تو اُن کا اصل مقصد یہ تھا کہ مغربی یورپ کو سوویت فوجیں آزاد نہ کرانے پائیں۔

مئی ۱۹۴۵ء میں سوویت اور دوسری اتحادی افواج کی کامیاب کارروائیوں نے نازیوں کو فیصلہ کن طور پر فوجی شکست دے دی۔ ستمبر میں جرمنی کے آخری باقیماندہ اتحادی جاپان نے بھی غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ جاپان کے ہتھیار ڈالنے سے صرف ایک مہینہ قبل امریکی ہوائی جہازوں نے صدر ٹرومین کے حکم سے ہیروشیما اور ناگاساکی کے جاپانی شہروں پر ایٹمی بم گرائے جن سے دونوں شہر صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ جاپان کے خلاف ایٹمی ہتھیاروں کا یہ وحشیانہ استعمال کسی فوجی ضرورت کا تقاضہ نہیں تھا کیونکہ عملی طور پر جاپان کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ ساری دنیا اور خاص طور پر سوویت یونین یہ جان لے کہ مابعد جنگ دنیا میں امریکی سامراجی لیڈر شپ کو کبھی چیلنج نہ کیا جائے۔ لیکن امریکی ایٹمی حکمت عملی کے ماہرین کی یہ اُمیدیں پوری ہونے والی نہیں تھیں۔ دوسری جنگ عظیم نے سرمایہ دارانہ نظام کو ناقابلِ تلافی زبردست نقصان پہنچائے۔ عالمی سرمایہ دارانہ نظام

اپنے بحران کے دوسرے دور میں داخل ہوا اور اس کا اثر و رسوخ بدستور کم ہوتا گیا۔

دوسری جنگ عظیم اور کمینٹرن کا خاتمہ

کمیونسٹ انٹرنیشنل یا کمینٹرن ایک ایسے دور میں قائم ہوئی جب سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں بیشتر سرمایہ دار ممالک کے مزدوروں میں کافی اثر و نفوذ رکھتی تھیں۔ انہیں منظم مزدوروں کی غالب اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ اصلاح پسندی کے رجحانات "مزدور اشرافیہ" میں ایک وسیع سماجی بنیاد رکھتے تھے، جس کی وجہ پرولتاریہ کے ایک حصے میں بورژوازی کیجانب سے بڑی مہارت سے اصلاح پسندی کا نفوذ، موقع پرست قیادت کو براہ راست دیجانے والی امداد، سوشل ڈیموکریسی کی قدیم روایات اور بعض یورپی ممالک میں پرولتاریہ کے انقلابی اقدامات کی پسپائی تھی۔

انقلابی اُبھار کے ابتدائی سالوں میں محنت کش طبقات نے جو سماجی اور جمہوری حقوق حاصل کیے تھے، سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں نے انہیں اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا۔ یہ پرچار شروع ہوا کہ ہم ایسے دور میں داخل ہو چکے ہیں جب سرمایہ داری بتدریج سوشلزم میں ڈھل رہی ہے اور پارلیمانی جمہوریت ہی سوشلزم کیجانب عبور کی واحد راہ ہے اور محنت کشوں کے انقلابی اقدامات کی ضرورت ختم ہو چکی ہے۔ اپنی پوزیشن کو قائم رکھنے اور مزید مضبوط کرنے اور عوام میں کمیونسٹ اثرات کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے انقلابی کارکنوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع ہوئیں۔ انہیں ٹریڈ یونینوں سے نکالا جانے لگا، ٹریڈ یونین تنظیموں کو منقسم کیا جانے لگا اور انقلابی تحریک سے نمٹنے کیلئے حکومت اور ریاستی مشینری سے براہ راست تعاون سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔

ایسی مشکل صورتحال میں کمیونسٹ انٹرنیشنل سامنے آئی اور کمیونسٹ پارٹیوں کو منظم اور مضبوط کرنے کی جدوجہد کی راہنمائی کرنے لگی۔ کمینٹرن کے سرکردہ رہنما اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ کمیونسٹوں کو باقاعدہ اور منظم مزدور طبقے کی اکثریت کی حمایت حاصل

کرنا کس قدر ضروری ہے اور یہ کام پرانی ٹریڈ یونینوں میں کام کے ذریعے ہی شروع ہوگا۔

لیکن ۱۹۲۷ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کو "بائیں بازو" کے دباؤ کے سامنے جھکنا پڑا اور ایک نئی حکمت عملی اپنائی گئی جو بعد میں "طبقہ بالمقابل طبقہ" CLASS AGAINST CLASS کے نام سے جانی جانے لگی۔ اس نئی حکمت عملی کا مقصد مزدور طبقہ کی انقلابی سرگرمیوں کو فروغ دینا تھا۔ بعض مواقع پر اس حکمت عملی کی مدد سے کمیونسٹوں نے موقع پرست مزدور رہنماؤں کو بے نقاب بھی کیا لیکن اس کے مضر اثرات بھی جلد ہی منظر عام پر آنے لگے۔ اس نئی حکمت عملی کے تحت اصلاح پسند تنظیموں کو ایک ایسی قوت قرار دیا گیا جو قطعی طور پر بورژوازی کا آلہ کار بن چکی ہے۔ اس بات پر زور دیا گیا کہ ان تنظیموں سے تعلق قطع کئے بغیر مزدور طبقہ متحد نہیں ہو سکتا۔ اس پالیسی کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے مزدور اتحاد کو تو خاطر خواہ مدد نہیں ملی البتہ اس سے اصلاح پسند تنظیموں میں کام کرنے والے محنت کشوں اور کمیونسٹوں میں خلیج بڑھ گئی اور بعض جگہوں پر پارٹی کا انقلابی کارکن عام دھارے سے کٹ کر رہ گئے۔

آئندہ آنے والے برسوں میں کمنیٹرن نے اپنی سابقہ تنگ نظر پالیسیوں پر قابو پانے کیلئے جدوجہد شروع کی۔ فاشزم اور جنگ کے منڈلاتے ہوئے خطرے کے پیش نظر کمنیٹرن اور اُس کے ممبر ارکان نے تمام فاشسٹ دشمن قوتوں کے اتحاد کی اہمیت پر زور دیا۔ کمنیٹرن نے ایسے نظریات کی شدت سے مخالفت کی جن کےمطابق فاشزم سرمایہ دارانہ نظام کے انحطاط و انتشار میں ایک لازمی تاریخی مرحلہ تھا۔ اس طرح کے خیالات بائیں بازو کے اُن نظریات سے متاثر تھے جن کے مطابق فاشزم بذات خود تیزی سے اپنے انجام کی جانب بڑھ رہا ہے اور اس طرح فاشزم کے خطرے کو کم کر کے دیکھتے تھے۔ ایسے نظریات دوسرے طبقات کے ساتھ پرولتاریہ کے اتحاد کی راہ میں مانع تھے۔ اس منطق کے مطابق اگر سرمایہ داری اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہی ہے اور اس کی تباہی کے لئے ایک طاقتور پرولتاری انقلاب کی ضرورت نہیں تھی تو اُسے اتحادیوں کی کیا ضرورت ہے۔ کمنیٹرن کےمطابق

"فاشزم محض سرمایہ داری کے بحران کا مظہر ہی نہیں ہے بلکہ سرمایہ داری کا ایک جارحانہ ہتھیار بھی ہے جس میں ایسے عناصر موجود ہیں جو سرمایہ داری کو اس بحران سے نکلنے میں مدد دے سکیں۔ فاشزم سرمایہ داری کا دفاع ہی نہیں، اس کی جارحیت بھی ہے۔

لیکن بعض مزدور جماعتوں میں سابقہ تجرویوں سے نجات حاصل نہیں کی جا سکی اور قوتوں کے نئے توازن پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ رجعت پسندی اور فاشزم کے خلاف محنت کشوں کی جدوجہد کو سوشلسٹ انقلاب کے لئے براہ راست تیاریوں سے جوڑ اگیا اور پرولتاری آمریت کو فوری سیاسی مقصد قرار دیا گیا۔ لیکن یہ نعرہ جہاں یہ ظاہر کرتا تھا کہ کمیونسٹوں میں انقلابی جوش و جذبہ برقرار ہے وہیں یہ نعرہ اس دور میں سرمایہ دار ممالک کی پیچیدہ اور متضاد صورتحال پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اسے محنت کشوں اور دیگر درمیانے طبقات میں پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔

ٹراٹسکی وادیوں کی "چوتھی انٹرنیشنل" نے اپنے مینی فیسٹو میں کمینٹرن کی اس حکمت عملی کو منافقانہ جدوجہد سے انحراف قرار دیا اور اسے سرمایہ داری کی مردہ لاش کو گھسیٹنے کے مترادف قرار دیا۔ بعد کے واقعات نے کمینٹرن کے پروگرام کی دانائی کی توثیق کر دی جب فاشسٹ دشمن متحدہ محاذوں نے بہت سے ممالک کے چناؤ میں فیصلہ کن فتح حاصل کی اور رجعت پسند فاشسٹ طاقتوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔

یہ وہ حالات تھے جب نوع انسانی کو جنگ نے آ لیا۔ جنگ، مختلف کمیونسٹ پارٹیوں کی پوزیشن میں واضح فرق اور انہیں درپیش مخصوص مسائل کا تنوع جنگ سے پہلے کے سالوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اس بات کا متقاضی تھا کہ یہ پارٹیاں اپنے اپنے ملک کے ٹھوس حالات میں آزادانہ طور پر تاریخی انقلابی فریضہ سرانجام دیں۔ بعد میں پیش آنے والی تبدیلیاں اس بات کا واضح ثبوت تھیں کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی پہلی کانگریس میں طے کیجانے والی تنظیمی شکل جو عالمی مزدور تحریک کے اس دور کے تقاضوں سے بھرپور مطابقت رکھتی تھی اب اس تحریک کے مزید پھیلاؤ

اور انفرادی ملکوں میں وہاں کے ٹھوس پیچیدہ مسائل کے اُبھرنے سے اپنی ابتدائی افادیت کھو بیٹھی تھی اور اکثر اوقات تو یہ تنظیمی شکل مختلف قومی پارٹیوں کی مضبوطی اور مزید پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ تک بن رہی تھی۔ ان تمام تر وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے کمنٹرن کی مجلس عاملہ نے تمام کمیونسٹ پارٹیوں کی رضامندی سے مئی ۱۹۴۳ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

بہت سے ترمیم پسند عناصر کی جانب سے آج بھی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ سوویت پارٹی جو کہ کمنٹرن میں نمایاں حیثیت رکھتی تھی، نے سرمایہ دار اتحادیوں کی حمایت حاصل کرنے اور اُنہیں جنگ کے دوران یورپ میں دوسرا فرنٹ کھولنے کی ترغیب دینے کے لئے کمیونسٹ انٹرنیشنل کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بالفرض اگر سوویت پارٹی کمنٹرن میں اُتنا ہی اثر و رسوخ رکھتی تھی جتنا کہ بتایا جاتا ہے تو اُسے اپنی پالیسی منوانے کے لئے اس تنظیم کو ختم کرنے کی بجائے برقرار رکھنے کی ضرورت تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر واقعی اس عالمی تنظیم کو کچھ وقتی تقاضوں کی وجہ سے توڑا گیا تھا تو آج اس تنظیم کے احیاء میں کونسی رکاوٹیں درپیش ہیں۔ ظاہر ہے عالمی مزدور تحریک کے ان قائدین کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ہے۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کا خاتمہ عالمی مزدور تحریک کی کمزوری ظاہر نہیں کرتا جیسا کہ اس تحریک کے بہت سے مخالفین تصور کرتے ہیں۔ مارکسزم لینزم اور پرولتاری بین الاقوامیت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مزدور پارٹیاں مزید جوش و خروش سے فاشزم کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد میں شریک ہوئیں۔ جنگ سے پہلے اس کرہ ارض پر بیالیس لاکھ کمیونسٹ تھے جن کی تعداد جنگ کے اختتام پر دو کروڑ کے ہندسے کو چھو رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹیوں نے عوام میں زبردست مقبولیت حاصل کی اور وہ ایک بااثر عالمگیر سیاسی قوت میں تبدیل ہونے لگیں۔ محنت کشوں اور جمہوری قوتوں کے اتحاد کی لیننی پالیسی کے نتیجے میں دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام پر ایک طاقتور مزدور تحریک بننے کے حالات سازگار ہو چکے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ جمہوری انقلابات

کے نئے دور کی نوید لے کر آیا۔

دوسری عالمگیر جنگ کا خاتمہ اور عوامی جمہوری انقلابات

دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ فاشزم کی مکمل تباہی کا پیغام ثابت ہوا اور عالمی مزدور و جمہوری تحریک اور قومی تحریک آزادی کو زبردست مہمیز ملی۔ اس جدوجہد میں وہ لاکھوں لوگ بھی شامل ہونے لگے جو اپنے تجربے سے یہ جان چکے تھے کہ سرمایہ داری کا سماجی اور سیاسی نظام نہ صرف جمہوریت کی مزید ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے بلکہ اُن معاشی اور سیاسی حقوق کا تحفظ بھی نہیں کر سکتا جو مزدور طبقہ اور دوسری ترقی پسند قوتیں جنگ سے پہلے اپنی طبقاتی جدوجہد کے نتیجے میں حاصل کر چکے تھے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر نازی جارحیت اور جاپانی عسکریت کا شکار ہونے والے تقریباً تمام ممالک میں انقلابی صورتحال جنم لے رہی تھی۔ لیکن بہت سے ممالک میں انقلابی عمل کے مقدر کا فیصلہ وہاں پر طبقاتی قوتوں کے توازن کی بنیاد پر نہیں ہوا۔ اور عالمی صورتحال نے اس عمل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

وہ ممالک جن پر برطانوی اور امریکی تسلط قائم ہوا وہاں عالمی سامراج نے مقامی رجعت پسند عناصر سے اشتراک کرتے ہوئے اور معاشی، سیاسی اور بعض اوقات فوجی دباؤ اور مداخلت کے ذریعے ان ممالک میں جمہوری اصلاحات کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ ان ممالک میں انقلابی عمل کی مزید ترقی کو بزور طاقت روکا گیا اور اُن میں بورژوا نظاموں کو فروغ دیا گیا۔ وہ ممالک جو سوویت یونین کی مدد سے آزاد ہوئے، میں صورتحال کافی مختلف رہی۔ آزادی کے مشن کی کامیابی پر سوویت یونین نے اپنے سماجی نظام کو ان ممالک پر مسلط نہیں کیا۔ لیکن جنگ کے دوران نازی فاتحین کی استبدادی مشینری، جس کا تمام تر دارومدار تشدد پر تھا، کی تباہی، مقامی اجارہ داریوں اور گماشتہ سرمایہ داروں کے شدید رجعتی عناصر کی کٹھ پتلی حکومتوں کے اقتدار کا خاتمہ اور ردِ انقلاب کی جانب سے تحفظ نے ان ممالک میں ایسے سازگار حالات پیدا کیے

جس سے ان معاشروں کو جمہوری بنیادوں اور سوشلسٹ اصولوں پر استوار کرنا ممکن ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کی آخری لڑائیاں ابھی لڑی جانی تھیں تبھی وسطی اور جنوب مشرقی یورپ کے متعدد ملکوں نے اپنے لئے ایک نئی طرز زندگی کی تعمیر شروع کردی تھی۔ ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء کے دوران میں پولینڈ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، رومانیہ، چیکوسلواکیہ، ہنگری اور البانیہ کے محنت کش عوام نے زمیندارانہ اور سرمایہ دارانہ طبقے کا خاتمہ کردیا اور ریاستی اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس طرح سے یورپ کے بیچوں بیچ کئی ریاستیں وجود میں آگئیں جنہوں نے "عوامی جمہوریت" کا اسم جنس اختیار کیا۔ سرمایہ دارانہ دنیا کے رجعت پرست سیاستدان آج بھی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ وسطی اور جنوب مشرقی یورپ میں انقلابات سوویت سنگینوں کی نوک پر لائے گئے ہیں اور وہ تاریخی ارتقاء کا نتیجہ نہ تھے۔ حقیقت میں یہ دعوے سراسر جھوٹ پر مبنی ہیں۔

وسطی اور جنوب مشرقی یورپ کی قوموں نے سابقہ حکومتوں کے تحت سنگدلانہ مظالم برداشت کئے تھے۔ ان ملکوں کی دولت یعنی ان کی زمین، معدنیات، کارخانے، بنک اور اہم کاروبار دولت مند مالکوں کے ایک چھوٹے سے جتھے کے قبضے میں تھی جو انتہائی بے رحمی سے محنت کش عوام کا استحصال کرتے تھے۔ حکمران حلقوں نے ان ملکوں کو ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں وہ اہم سامراجی ریاستوں کے پوری طرح دست نگر تھے۔ محنت کش عوام کو داخلی اور خارجی یعنی دوہرے استحصال کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ ان ممالک کے سماجوں کو جو تضادات پارہ پارہ کر رہے تھے، انہیں دوسری جنگ عظیم نے نقطۂ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ اس جنگ کا سارا بار بھی محنت کش عوام پر ہی پڑ رہا تھا۔

بالآخر ان ملکوں کی وطن دوست قوتوں نے مزدور طبقے کی رہنمائی میں سوویت فوجوں کی مدد سے حملہ آوروں اور ملکی فاشسٹوں کے دوہرے جوئے کو اتار پھینکا۔ عوامی جمہوری اقتدار کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ ان انقلابات کی ابتداء میں بورژوازی کا ایک حصہ کمیونسٹوں کے ساتھ اقتدار میں شامل رہا، جس کا پیمانہ مختلف ممالک میں اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ بورژوازی

انقلاب کے بعد بھی بعض اہم سیاسی اور معاشی میدانوں پر اپنی گرفت برقرار رکھے ہوئے تھی۔ اس صورتحال کی وجہ محض عالمی سیاست کی خصوصیات ہی نہیں تھیں بلکہ خود محنت کش طبقات کے غالب حصے کی سیاسی بالیدگی کی سطح بھی تھی جنہوں نے وسیع تر جمہوری مطالبات کی حد تک تو کمیونسٹوں کی حمایت کی تھی لیکن وہ ابھی تک سوشلزم کی طرف بڑھنے کے تاریخی فریضے کو پوری طرح سمجھ نہیں پائے تھے۔

ایسی صورتحال میں ان ممالک کے کمیونسٹوں نے براہ راست سوشلزم کے نفاذ کی بجائے ایسی بتدریج بنیادی سیاسی، سماجی اور معاشی اصلاحات پر زور دیا جنہیں محنت کش طبقات کے وسیع تر حصوں کی فعال مدد کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔ نئی حکومتوں کے قیام کے بعد جو اصلاحات رائج کی گئیں وہ شروع ہی سے بورژوا جمہوری حکومتوں کے تحت ہونے والی اصلاحات سے زیادہ دور رس تھیں۔ ان اصلاحات کے ذریعے فاشزم اور جاگیردارانہ رشتوں کی ساری باقیات کو ختم کرنے کے علاوہ بڑی اور متوسط بورژوازی کے ہاتھوں محنت کش عوام کے استحصال پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ نئی حکومتوں نے محنت کش عوام کو تقریر، پریس، اجتماع اور تنظیم کی آزادی دی صنعتی اداروں میں مزدوروں کا کنٹرول قائم کیا گیا اور اشراف سے زمین لے کر محنت کش کسانوں کے حوالے کر دی گئی۔

زرعی اصلاحات کے نفاذ، بڑے پیمانے کی صنعت کے قومیائے جانے اور ریاستی مشینری کو جمہوری بنانے کے اقدامات کو بورژوا عناصر کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکہ، برطانیہ اور دوسرے سرمایہ دارانہ ممالک کی اجارہ داریاں ان رجعت پرست عناصر کی سرگرم مدد کرتی تھیں۔

پولینڈ میں جن برسوں میں حکومت کی عوامی جمہوری شکل جڑ پکڑ رہی تھی اور مضبوط ہو رہی تھی، انقلاب دشمن جتھوں نے ۲۰ ہزار کمیونسٹوں اور جمہوریت پسندوں کو قتل

کر دیا۔ ہنگری میں جنوری تا مئی ۱۹۴۷ء کے دوران جمہوریت دشمن سازش ناکام بنا دی گئی۔
اس بغاوت کو جائیداد سے محروم کر دیئے جانے والے زمینداروں، شہری بورژوازی اور
مالدار کسانوں کی حمایت حاصل تھی چیکوسلواکیہ میں بھی ایک انقلاب دشمن فوجی بغاوت
کی کوشش کی گئی اور اس کا بھی یہی انجام ہوا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں ۱۲ رجعت پرست بورژوا
وزیروں نے حکومت سے استعفیٰ دے دیا، جو مسلح بغاوت شروع کرنے کا سگنل تھا۔ چیکوسلواکیہ
کے عوام نے رجعت پرستوں پر زوردار جوابی وار کیا۔ مزدوروں، دستکاروں اور محنت کش
کسانوں نے انقلابی نظام کو برقرار رکھنے کیلئے عملی کمیٹیاں بنا لیں۔

استحصالی عناصر رفتہ رفتہ عوام سے سیاسی طور پر کٹتے گئے اور بالآخر اپنی بچی کھچی
سیاسی اور معاشی حیثیت سے بھی محروم کر دیئے گئے اور ریاستی اقتدار کو مزدور طبقے اور اس سے قریبی
اتحاد رکھنے والے محنت کش کسان طبقے نے پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ عمل مختلف ممالک
میں فرق رفتار سے ہوا لیکن ۱۹۴۹ء تک یہ عمل پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا تھا۔ حکومتی اداروں
سے بورژوا نمائندوں کو نکالنے کا عمل نسبتاً پُرامن تھا۔ بورژوازی نے اپنے مورچوں کی مدافعت
کے لئے اسلحہ نہیں اُٹھایا چونکہ وہ جانتی تھی کہ عوام اُس کی حمایت نہ کریں گے۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کے دوران چیکوسلواکیہ، بلغاریہ، ہنگری اور رومانیہ میں صنعتی
کارخانوں کی بڑی اکثریت ذاتی ملکیت سے سارے عوام کی ملکیت میں منتقل کر دی گئی البتہ
چھوٹے تجارتی اداروں اور کارگاہوں کے مالکوں کو انہیں رکھنے کی اجازت دی گئی۔ اس طرح ان
ممالک میں ایک سوشلسٹ سماج کی تعمیر شروع ہوئی۔ جس میں سارے شہریوں کو صرف لفظی
طور پر ہی نہیں بلکہ عمل میں مساویانہ حقوق حاصل ہوں اور جہاں ہر شخص جتنی محنت کرے
اسی تناسب سے زندگی کی آسائشوں کا حصہ دار ہو۔

جنوبی اور جنوب مشرقی یورپ کے بعض ممالک میں عوامی جمہوری انقلابات کی ترقی نے
اس تھیس کو جنم دیا کہ ان ممالک میں سوشلزم پرولتاری آمریت کے بغیر بھی برپا کیا جا سکتا

ہے۔ اس تھیس کی بنیاد یہ نظریہ تھا کہ پرولتاری آمریت صرف اُس مخصوص شکل ہی میں وجود نہیں رکھتی ہے جیسی کہ روس میں اکتوبر انقلاب کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ اس چیز کا اظہار بھی تھا کہ سرمایہ داری سے سوشلزم کی طرف عبور میں ان ممالک کے استحصالی طبقات اس قدر مدافعت نہیں کریں گے۔ لیکن ۱۹۴۸ء تک ان ممالک میں پرولتاری آمریت کے بغیر سوشلزم کی تعمیر کے خیال کو خیرباد کہہ دیا گیا۔ اس عمل کے دوران ایک نیا نظریہ وجود میں آیا جس کے مطابق پرولتاری آمریت کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں، سوویت اور عوامی جمہوری۔

یورپ میں سوشلزم کی قوت میں بڑا اضافہ ۱۹۴۹ء کے موسم خزاں میں جرمن عوام کی پہلی مزدور اور کسان ریاست کا وجود میں آنا تھا۔ مغربی جرمنی میں جہاں امریکی، برطانوی اور فرانسیسی فوجوں کا قبضہ تھا چیزوں نے دوسری ہی صورت اختیار کی یہاں پر مغربی طاقتوں نے بڑی سرمایہ دارانہ اجارہ داریوں کو پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دی اور مختلف رجعت پرست تنظیمیں پھر سے سر اٹھانے لگیں۔ مغربی طاقتوں کے حکمران حلقے چاہتے تھے کہ جرمنی دو ٹکڑوں میں بٹا رہے اور اس کے مغربی حصّے کو سوویت یونین اور عوامی جمہوریتوں کے خلاف کارروائیاں کرنے کا اڈہ بنا دیا جائے۔ مشرقی جرمنی کے محنت کش عوام کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ ساری وطن دوست قوتوں کو متحد کرلیں اور صحیح معنوں میں ایک جمہوری ریاست کی تخلیق کریں۔ اس طرح جرمن عوام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی ریاست قائم کی گئی جس کی داخلہ اور خارجہ پالیسیاں مٹھی بھر استحصال کاروں کے مفادات کے مطابق نہیں بلکہ سارے عوام کے مفادات کے مطابق منصوبہ کی گئی تھیں۔

جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو چین دو کیمپوں میں بٹا ہوا تھا۔ ملک کا تین چوتھائی حصّہ چیانگ کائی شیک حکومت کے تسلط میں تھا جس کے پاس دسیوں لاکھ فوج تھی اور اس کے کافی بڑے حصّے کو امریکیوں نے تربیت اور اسلحے دیئے تھے۔ جبکہ باقی آزاد شدہ علاقوں پر ایک عوامی حکومت قائم تھی جسے آبادی کی زبردست اکثریت، عوامی فوج آزادی اور عوامی رضاکاروں کی حمایت حاصل تھی۔ انقلاب کی ان قوتوں کی رہنمائی چینی کمیونسٹ

پارٹی کررہی تھی۔

۱۹۴۶ء میں چیانگ کائی شیک سازشی گروہ نے گماشتہ بورژوازی کے اکسانے پر عوامی فوج آزادی کے خلاف فوجی کارروائی شروع کردی جس نے ایک خانہ جنگی کی شکل اختیار کرلی جو تین سال سے زائد عرصے تک جاری رہی۔ اس خانہ جنگی کے دوران رجعت پرست حلقوں کو امریکیوں کی زبردست مالی اور فوجی امداد حاصل رہی۔ لیکن عوامی فوج نے زبردست ذہانت اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کومنتانگ فوجوں کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کردیا اور چیانگ کائی شیک نے اپنی بچی کھچی افواج کے ساتھ بھاگ کر جزیرہ تائی وان پر پناہ لی جس پر بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مسلح افواج کا قبضہ تھا۔ چین میں ایک عوامی جمہوری ڈکٹیٹر شپ قائم ہوئی اور چینی عوام سوشلسٹ تعمیر کی راہ پر گامزن ہوئے۔

دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی شکست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوریا میں بھی اس کا غلبہ ختم ہوگیا۔ فتح مند طاقتوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے شمالی کوریا میں جاپان کے ہتھیار ڈالنے کی شرطوں پر عمل درآمد کی نگرانی سوویت فوجی کمان کو اور جنوبی کوریا میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی فوجی کمان کو کرنی تھی۔ جب شمالی کوریا کو حملہ آوروں سے پاک کردیا گیا تو جمہوری اصلاحات کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ صنعتی کارخانوں، بینکوں، ریلوے اور ذرائع رسل و رسائل کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا جو اس سے قبل جاپانیوں اور ان کے کوریائی حلیفوں کی ملکیت تھے۔ صنعت میں آٹھ گھنٹے کام کا دن رائج کیا گیا اور نابالغوں اور عورتوں کی اُجرتیں بھی مردوں کے برابر کردی گئیں۔ اگست ۱۹۴۶ء میں کوریائی کمیونسٹ پارٹی اور نئی عوامی پارٹی کو ملا کر کوریائی لیبر پارٹی کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے صدر کم ال سنگ منتخب ہوئے۔ اس پارٹی نے مزدوروں، کسانوں، ملازمین اور ان چھوٹے کاروباری لوگوں کا ایک متحدہ جمہوری قومی محاذ منظم کیا جو جمہوری اصولوں پر قومی ارتقاء کے حق میں تھے۔

جنوبی کوریا میں واقعات نے دوسری روش اختیار کی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے فوجی ہیڈکوارٹر نے پرانے استعماری نظام کو برقرار رکھا جس سے عوام کو شدید نفرت تھی۔ صرف اتنا فرق آیا کہ جاپانیوں کی جگہ امریکیوں نے لے لی تھی۔ بیروزگاری فاقے اور شدید محتاجی ابھی تک جنوبی کوریا کے عوام کی غالب اکثریت کا مقدر تھی۔ اگست ۱۹۴۸ء میں شمالی اور جنوبی کوریا کی ترقی پسند قوتوں کی متحدہ کوششوں کی بدولت پورے ملک میں عام چناؤ منعقد ہوئے۔ عوامی اسمبلی کے پہلے اجلاس نے پورے کوریائی عوام کی مرضی کے مطابق ایک خود مختار ریاست کی حیثیت سے کوریائی جمہوری ری پبلک کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جس کا مقصد سوشلزم کی بنیاد کی تعمیر قرار دیا گیا۔ اسمبلی نے امریکہ اور سوویت یونین سے درخواست کی کہ وہ اپنی اپنی فوجیں کوریا سے ہٹا لیں۔ اس درخواست پر عمل کرتے ہوئے ۱۹۴۸ء کے آخر تک شمالی کوریا سے ساری سوویت فوجیں ہٹالی گئیں۔ اس کے برعکس امریکہ کی حکومت نے نہ صرف یہ کہ جنوبی کوریا سے اپنی قبضہ گیر فوجوں کو نہیں ہٹایا بلکہ اُس نے عوامی جمہوری ری پبلک کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ویت نام پر جاپانی فوجوں کا قبضہ تھا۔ لیکن ویت نام کے عوام نے فوجی قبضے کی اس حکمرانی کو گوارا کرنے سے انکار کر دیا۔ کسانوں اور مزدوروں نے حملہ آوروں کے خلاف چھاپہ مار جنگ چھیڑ دی جس میں پیٹی بورژوازی بھی شریک تھی۔ کمیونسٹ اس جدوجہد کی صف اوّل میں تھے۔ اس مسلح مزاحمت کے دوران ایک جنگ آزمودہ عوامی فوج وجود میں آ گئی جس نے آزاد ہونے والے علاقوں میں عوامی کمیٹیاں قائم کر دیں۔ ستمبر ۱۹۴۵ء میں پورے ملک میں بغاوت ہو گئی جس نے جاپانیوں اور اُن کے پٹھوؤں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور ویت نامی جمہوری ری پبلک کے قیام کا اعلان کر دیا گیا جس کا صدر ویت نامی کمیونسٹوں کے لیڈر اور ویت نام کی آزادی و خود مختاری کے ممتاز مجاہد ہوچی منہہ کو منتخب کیا گیا ہے۔

لیکن ویت نامی عوام کی پُرامن زندگی زیادہ دنوں نہیں چلنے پائی تھی کہ جاپانی شکست کو یقینی بنانے کے بہانے سے جنوب میں برطانوی فوجیں اور شمال میں چینی کومنتانگ فوجیں نمودار ہوئیں۔ فرانس نے بھی اپنی فوجیں مجتمع کیں اور دسمبر ۱۹۴۶ء میں ایک وسیع محاذ پر جارحانہ حملہ کرکے ویت نامی عوام کے خلاف وہ جنگ شروع کی جسے خود فرانس کے محنت کش عوام نے بجا طور پر "غلیظ جنگ" کا نام دیا۔ یہ جنگ آٹھ طویل برسوں تک جاری رہی جس کے دوران لاکھوں ویت نامی محنت کش مارے گئے۔ لیکن یہ سب بے سود رہا ویتنامی عوام نے محنت کش عوام کی پارٹی کی رہنمائی میں اور بین الاقوامی مزدور تحریک کی حمایت سے حملہ آوروں کو پے درپے شکست دی اور انہیں عارضی صلح کی بات چیت کرنے پر مجبور کردیا۔ جنگ کو ختم کرنے کے معاہدے پر دستخط ہوئے اور ملک کو عارضی طور پر شمالی اور جنوبی ویتنام میں تقسیم کردیا گیا۔ کانفرنس کے فیصلے کے مطابق دو سال میں ایک کل ویت نام پارلیمنٹ کے انتخابات ہونے تھے جس کے بعد ملک کے دونوں حصے مل کر ایک واحد ریاست بنا سکتے تھے۔ لیکن اس فیصلے پر کبھی عملدرآمد نہیں ہوا۔ جنوبی ویتنام میں ایک زمیندارانہ و سرمایہ دارانہ حکمرانی قائم ہوئی۔ یہ ایک رجعت پرست دہشت پسند حکومت تھی جو محض امریکی ڈالروں اور اسلحے کی مدد سے قائم رہ سکی۔ شمالی ویتنام میں شہری اور دیہی محنت کش عوام ریاستی اقتدار پر قابض ہوئے اور ملک میں سوشلزم کی تعمیر کا کام شروع کیا۔

یورپ اور ایشیا کے انقلابات روس کے اکتوبر ۱۹۱۷ء کے بعد سے دنیا کی تاریخ کے اہم ترین واقعات تھے۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ اور ایشیا میں ۱۲ ممالک عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے الگ ہوگئے۔ اس کے نتیجے میں سرمایہ داری کا عام بحران شدید تر ہوا، اور انقلابی و سامراج دشمن قومی تحریک آزادی نے مزید وسعت حاصل کی۔ عوامی جمہوریتوں کے وجود پذیر ہونے کے بعد سوشلزم صرف دو ملکوں ہی تک محدود نہیں رہ گیا تھا۔ اب البانیہ، بلغاریہ، ہنگری، ویتنام، جرمنی، چین، کوریا، منگولیا، پولینڈ، رومانیہ،

یوگوسلاویہ اور چیکوسلواکیہ بھی سوشلزم کی راہ پر گامزن تھے ۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے سوشلسٹ ممالک کرہ ارض کے ۱۷ فیصد حصّے اور اس کی آبادی کے نو فیصد حصّے پر محیط تھے جبکہ جنگ کے بعد سوشلسٹ ممالک ہماری زمین کے ۲۵ فیصد رقبے اور ۳۳ فیصد آبادی پر محیط تھے ۔

سوشلزم اور جمہوریت کے اثر اور اس کی قوت کشش کی قطعی مثال کیوبا کے عوامی انقلاب میں ملتی ہے ۔

دسمبر ۱۹۵۶ء کی ایک تاریک رات کو کیوبا کے جنوب مشرقی ساحل کے ایک سنسان مقام پر لوگوں کی ایک چھوٹی سی جماعت اتری ۔ اس کے اراکین کیوبا کے وہ وطن دوست انقلابی تھے جو ظلم اور جبر سے بچنے کے لئے اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے ۔ ان کی رہنمائی ایک نوجوان وکیل فیڈل کاسترو کر رہے تھے ۔ سرکاری افواج سے اپنی پہلی ہی جھڑپ میں ان ۸۲ انقلابیوں میں سے صرف ۱۲ زندہ بچے ۔ ہتھیار ڈالنے کی بجائے فیڈل کاسترو اپنے ساتھیوں کو لے کر سیئرا مائسترا کوہستان کے جنگلوں میں چلے گئے جہاں انہوں نے پناہ لی اور کیوبا کے عوام کی آزادی کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کی تیاریاں کیں ۔

جنگل کی اس پناہ گاہ سے ایک چھوٹے سے ٹرانسمیٹر نے ایک پیغام بھیجا جس نے کیوبا کے عوام کو بتایا کہ اس بغاوت کا مقصد صرف بتستا کی آمریت کو ختم کرنا ہی نہیں بلکہ ملک کی معاشی سیاسی اور سماجی آزادی بھی ہے ۔ اس پہاڑی گڑھ میں وطن دوستوں کی جانبازانہ جدوجہد کی خبر دیہات میں آگ کی طرح پھیل گئی اور وہ تمام لوگ کاسترو کی جماعت میں شریک ہونے لگے جو بتستا کی حکومت سے نفرت کرتے تھے اور جو اس کے خلاف ہتھیار اٹھانے کو تیار تھے ۔ چھاپہ مار فوج بڑی تیزی سے بڑھنے لگی اور ۱۹۵۸ء تک اس کی صفوں میں کئی ہزار لوگ ہو گئے ۔ امریکہ کی سرگرم مدد کے باوجود بتستا کی فوجوں کو پے در پے لڑائیوں میں شکست ہوئی اور پہلی جنوری ۱۹۵۹ء کو باغی ہوانا میں داخل ہو گئے ۔ کیوبا کا انقلاب

فتح مند ہو چکا تھا جو کہ عوامی، جمہوری اور سامراج دشمن انقلاب تھا اور یہاں کی حکومت عوام کی مکمل حمایت سے اپنے دور رس انقلابی اور جمہوری اصلاحات کے پروگرام پر عمل کر سکتی تھی۔

عوامی جمہوری ریاستوں میں انقلاب دشمنی اور نظریاتی کجرویاں

عوامی جمہوری ریاستوں میں اس نئی طرز زندگی کا جنم ایسا عمل نہیں تھا جو بالکل ہموار اور بے روک رہا ہو۔ اس کے برعکس سوشلسٹ نظام پرانے نظام کے ساتھ شدید تصادم کے حالات میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ سرمایہ دار اور زمیندار جو اپنے سیاسی اقتدار سے محروم کئے جا چکے تھے، کاروباری، تاجر، سوداگر، منافع خور اور مالدار کسان جن کی دولت چھن چکی تھی ابھی تک یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام پھر سے قائم ہو جائے گا اور وہ تاریخ کے پہیے کو پلٹنے کے لئے کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

دوسری جانب انقلابی قوتیں اور اُن کی تنظیمیں بھی تجربے کے اعتبار سے زیادہ پختہ اور آزمودہ کار نہیں تھیں۔ ان تنظیموں میں نوکر شاہانہ رجحانات نمایاں تھے اور بعض ممالک میں وہ خطرناک حد تک عوام سے کٹی ہوئی تھیں۔ سوشلسٹ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کو بری طرح سے پامال کیا جا رہا تھا۔ بعض سوشلسٹ ممالک میں محدود پیمانے پر نجی ملکیت برقرار رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے کسان اور شہری کاروباری اپنی انفرادیت پسند اور چھوٹے مالک کی ذہنیت سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔ ان ممالک میں ہر ایک کو اُس کے کام کے مطابق اُجرت کے اصول کو بھی بعض اوقات نظرانداز کیا جا رہا تھا جس سے عوام میں منفی ردعمل زور پکڑ رہا تھا جنہیں سماجی انصاف کے اصولوں کی تربیت دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ نفع خوری اور اپنی حیثیت کا ناجائز استعمال بھی کافی وسیع پیمانے پر رائج تھا۔ ان تمام تر تضادات کے ساتھ ساتھ مختلف حکومتی اداروں میں عوام کی بھرپور شرکت کو ممکن بنانے کیلئے خاطرخواہ اقدامات نہیں کیے گئے۔

جنگ کے بعد سے سوشلسٹ ملکوں میں جو طبقاتی تصادم چل رہا تھا اُس کی واضح مثال ہنگری میں ۱۹۵۶ء کے واقعات تھے، سوشلسٹ جمہوریت کے اصولوں کی پامالی سے آبادی میں جو قابلِ فہم بے اطمینانی پائی جاتی تھی، انقلاب دشمن قوتوں نے اُس سے خوب فائدہ اٹھایا اور مغربی ریاستوں کے جارحیت پرست عناصر کی باقاعدہ شہ اور امداد سے حکومت پر جبری قبضہ کرنے کی کوشش کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کی سوشلسٹ حاصلات کو تباہ کر دیا جائے، اسے سوشلسٹ برادری سے الگ کر دیا جائے اور دوسری عوامی جمہوریتوں کے خلاف جنگ کے لئے اڈہ بنا دیا جائے۔ یہ انقلاب دشمن بغاوت سابق سرمایہ داروں اور زمینداروں، شہری پیٹی بورژوازی، متذبذب دانشوروں اور یونیورسٹی کے طالب علموں کی بعض پرتوں کی جانب سے کی گئی جس میں مزدور طبقے کے بعض عناصر بھی شامل تھے۔ لیکن مزدوروں اور کسانوں کی غالب اکثریت نے انقلاب دشمنی کا ساتھ نہیں دیا۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں ہنگریائی کمیونسٹ تحریک کے ممتاز رہنما یانوش کادر کی سرکردگی میں ایک انقلابی مزدور کسان حکومت قائم ہوئی جس نے سابقہ قیادت کی غلطیوں اور اختیارات کے ناجائز استعمال کی تلافی و تصحیح کرنے اور سوشلزم کی جانب مزید ترقی کے پروگرام کا اعلان کیا۔ انقلابی مزدور اور کسان حکومت نے انقلاب دشمنی کو دبانے کے لئے سوویت یونین سے مدد کی درخواست کی۔ اپنے بین الاقوامیت پسندانہ فرائض کی تکمیل کرتے ہوئے سوویت یونین نے یہ درخواست قبول کی اور ہنگریائی انقلابی قوتوں اور سوویت فوج کے دستوں کی مشترکہ کوششوں کے نتیجے میں انقلاب دشمنی کو شکست ہوئی۔

جہاں تک نسبتاً کم ترقی یافتہ ممالک میں انقلاب کا تعلق ہے تو اُن میں اکثر اوقات یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ اپنے سابقہ نوآبادیاتی ماضی کے بوجھ سے نجات حاصل کرنے اور ترقی کے اہم مسائل حل کرنے کے لئے ان ممالک کے رہنما انتہا پسند اقدامات اٹھاتے تھے جن میں اُن کی یہ خواہش جھلکتی تھی کہ وہ فوراً براہ راست کمیونسٹ پیداوار اور تقسیم کا نظام اپنالیں۔

ان تمام اقدامات کے پیچھے یہ یوٹوپیائی نظریات کارفرما تھے کہ قومی آمدنی کی تقسیم بہتر کر کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کیا جائے جبکہ پیداوار کی تنظیم کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا تھا۔ اس عمل کا دوسرا اہم عنصر موجودہ ڈھانچے کو جلد بازی سے تہس نہس کرنے کی خواہشات تھیں جس سے بہت سے منفی نتائج نے جنم لیا۔

ہمارے سامنے کیوبا کی مثال ہے جہاں صرف بڑے کارخانوں ہی کو نہیں قومیایا گیا بلکہ بیشتر چھوٹے چھوٹے صنعتی اور تجارتی اداروں کو بھی ریاستی ملکیت میں لینے کی کوشش کی گئی۔ پیداواری اجناس کو مفت تقسیم کیا گیا اور جنس اور پیسے کے رشتے کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر ایک کو اُس کی محنت کے مطابق اُجرت کے اصول کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ وہی اقدامات تھے جو سوویت روس میں انقلاب کے فوراً بعد اپنائے گئے تھے اور جنہیں بعد میں نئی معاشی پالیسی کے تحت ترک کر دیا گیا تھا۔ فیڈل کاسترو اس عمل کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں "انقلابات عموماً ایک یوٹوپیائی دور سے گزرتے ہیں جب اسے برپا کرنے والے اپنی خواہشات اور اُمنگوں کو عمل میں ڈھالنے کے دور میں یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ تاریخی مقاصد درحقیقت بہت قریب ہیں اور انسانی خواہشات معروضی حقائق سے بالاتر ہو کر ہر چیز حاصل کر سکتی ہیں"

اس معاملے میں چین کا تجربہ زیادہ ہمہ گیر اہمیت رکھتا ہے جس نے عالمی مزدور تحریک پر نہایت مضر اثرات مرتب کئے۔ ۱۹۵۸ء میں یہاں "زبردست چھلانگ" کی معاشی پالیسی کا اعلان کیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مختصر مدت میں صنعتی و زراعتی پیداوار میں کئی گنا اضافہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ پالیسی ملک کے حقیقی امکانات کو ملحوظ رکھنے سے قاصر رہی تھی اعلان تو یہ کیا گیا کہ چین اپنے معاشی ارتقاء کے لئے اپنے ہی وسائل پر بھروسہ کرے گا لیکن اس سلسلہ میں عملی اقدامات کا فقدان رہا۔ اس کے ساتھ ہی چین کے لیڈروں نے سوشلسٹ ممالک کے ساتھ اپنے معاشی رشتوں کو محدود کرنے کی کوشش کی اس پالیسی کیوجہ سے صنعتی پیداوار میں شدید کمی ہو گئی اور قومی معیشت میں سخت اتھل پتھل ہو گئی چنانچہ "زبردست چھلانگ"

لگانے کی کوشش ناکام ہوگئی۔ زراعتی پیداواری تجربے پیمانے سے نام نہاد "عوامی کمیونوں" کی طرف عبور میں بھی غلطیاں کی گئیں اور معمولی اوزاروں اور کسانوں کی ذاتی استعمال کی چیزوں تک پر اجتماعی ملکیت بندی کا اطلاق کیا گیا۔ "عوامی کمیون" کے ممبروں کو بلند تر پیداواری صلاحیت کے لئے ہر طرح کی معاشی ترغیب سے محروم کر دیا گیا۔ یہ کمیون قائم کر کے چینی لیڈروں نے پہلے سے کسی طرح کی مادی اور روحانی بنیاد تعمیر کئے بغیر کمیونزم کی براہ راست تعمیر کرنی چاہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارموں کی پیداوار بہت کم ہوگئی اور غذائی اشیاء اور صنعت کے لئے زرعی خام مواد کی فراہمی میں شدید قلت پیدا ہو گئی۔ ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۲ء میں غذا کی کمی کی وجہ سے کروڑوں شہری باشندوں کو دیہات میں نئے سرے سے آباد کیا گیا۔

معاشی دائرے میں بائیں بازو کے تجربوں اور ان کے برے نتائج کے علاوہ ۱۹۶۶ء سے چینی قائدین نے نام نہاد "عظیم پرولتاری ثقافتی انقلاب" شروع کیا جو کئی سال تک چلتا رہا۔ اس انقلاب کے دوران ماؤ کے ساتھیوں نے کئی پارٹی تنظیموں اور پرانے پارٹی و ریاستی کارکنوں کا خاتمہ کر دیا۔ بے حساب تہذیبی قدروں کو محنت کش عوام کے لئے "معاندانہ خیالات کا مخزن" قرار دے کر نیست و نابود کر دیا گیا۔ "ثقافتی انقلاب" کے ساتھ ساتھ ماؤ زے تنگ کی شخصیت پرستی کو بے مثال طریقے سے فروغ دیا گیا اور ماؤ کے خیالات کو جدید مارکسی فکر کا نقطۂ عروج قرار دیا گیا۔

اس صدی کی ساتویں دہائی میں البانیہ میں بھی سوشلسٹ تعمیر شدید دشواریوں میں مبتلا ہو چکی تھی۔ ملک کی حکومت اور پارٹی کی قیادت سوشلسٹ برادری اور عالمی مزدور تحریک سے دور ہوتی گئی۔ ماؤ پرست چین کی طرف البانیہ کا جھکاؤ بھی کسی طرح ان معاشی رشتوں کا کوئی خاص بدل پیش نہیں کر سکا جو البانیہ اور سوشلسٹ برادری کے یورپی ملکوں کے درمیان تھے کیونکہ خود چین کو ساتویں دہائی میں "عظیم ثقافتی انقلاب" نے بہت پیچھے دھکیل دیا تھا۔

فروری ۱۹۵۶ء میں سوویت کمیونسٹ پارٹی کی ۲۰ ویں کانگریس منعقد ہوئی، جس میں اسٹالن کی شخصیت پرستی کی قطعی طور پر مذمت کی گئی اور اس بات پر زور دیا گیا کہ لینن نے پارٹی کی سرگرمیوں اور اجتماعی پارٹی لیڈرشپ کے لئے جو معیار مقرر کئے تھے، اُن پر سختی سے کاربند رہنا چاہیئے۔ جہاں اسٹالن نے سوویت یونین کی تاریخ کے دشوار ترین دور میں کمیونسٹ پارٹی کی کامیابی سے رہنمائی کی اور معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا، وہیں اُن کی شخصیت پرستی، مخالفین کے ساتھ بدترین سلوک اور سوشلسٹ جمہوریت کی نفی کرنے میں اُن کا کردار عالمی مزدور تحریک میں ایک تاریک باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

سرمایہ دار دنیا میں مزدور تحریک

جنگ کے فوراً بعد کے سالوں میں عالمی مزدور تحریک میں جارحانہ رنگ نمایاں تھا، جس کی بڑی وجہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا کمزور ہونا تھا۔ مغربی یورپ اور امریکہ بڑے پیمانے کی ہڑتالوں کی زد میں تھے۔ امریکہ میں ریلوے کے تین لاکھ کارکنوں نے زبردست ہڑتال کی جبکہ اسٹیل کی صنعت کے سات لاکھ مزدور ہڑتال پر تھے۔ ان ہڑتالوں نے امریکی اجارہ داروں کو اُجرتوں میں بہت سی مراعات دینے پر مجبور کیا۔ فرانسیسی پرولتاریہ نے بھی جرات اور پامردگی کا مظاہرہ کیا اور ۱۹۴۸ء اور پھر ۱۹۵۳ء میں زبردست ہڑتالی تحریک منظم کی۔

اس دور میں عالمی مزدور تحریک کی اہم خصوصیت مزدور طبقے میں کمیونسٹوں کا بڑھتا ہوا اثر و نفوذ تھا، جنہوں نے تجربے کی بیش بہا دولت جمع کر لی تھی اور طبقاتی جنگ سے پیدا ہونے والے مشکل مسائل کو حل کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ ۱۹۴۳ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کو توڑ دیا گیا تھا جس کا ایک مقصد فاشزم کے خلاف جنگ میں وسیع تر عوام الناس کے اتحاد کو آسان بنانا تھا۔ فرانس میں مابعد جنگ انتخابات میں کمیونسٹوں کو ۲۹ رفیصد ووٹ ملے۔ اٹلی میں کمیونسٹوں کو ۲۰ رفیصد اور فن لینڈ میں ۲۵ رفیصد ووٹ ملے۔ ۱۹۴۵ء

اور ۱۹۴۷ء کے دوران کمیونسٹ نو یورپی ملکوں یعنی فرانس، اٹلی، بلجیم، ڈنمارک، ناروے، آئس لینڈ، آسٹریا، فن لینڈ اور لکسمبرگ کی حکومتوں میں شریک تھے۔ جنگ کے دوران بورژوا ملکوں میں کمیونسٹوں کی تعداد تین گنی ہو کر ۴۸ لاکھ تک پہنچ گئی۔

اس کے ساتھ ساتھ مزدور طبقے میں سوشلسٹ پارٹیوں کے اثر میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ فاشسٹ حملہ آوروں کے خلاف جدوجہد کے دوران سوشل ڈیموکریٹوں کی سرگرم شمولیت سے اُن کی پوزیشن مزید مستحکم ہوئی اور بہت سے سرمایہ دار ممالک میں اُنہوں نے اقتدار کی مسند سنبھال لی۔

ان حالات میں مزدور طبقہ کو ملک گیر اور عالمی سطح پر یکجا کرنے کی ضرورت ناگزیر تھی۔ اس اتحاد کی بنیاد جنگ کے دوران ہی پڑ چکی تھی جب سرمایہ دار ممالک کی پرولتاریہ کے دو اہم جتھے کمیونسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ فسطائی دشمنوں کے خلاف جدوجہد میں شانہ بشانہ شریک تھے۔ بہت سے ممالک میں مثلاً ۱۹۴۵ء میں ناروے کی کمیونسٹ اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نے مزدور طبقے کی ایک متحدہ پارٹی بنانے کے سوال پر مذاکرات تک کیے جبکہ بہت سے دوسرے ممالک میں عوامی دباؤ کے نتیجے میں سوشل ڈیموکریٹوں کو کمیونسٹوں سے تعاون پر مجبور کر دیا گیا۔

ستمبر ۱۹۴۵ء میں پیرس میں عالمی ٹریڈ یونین کانگریس منعقد ہوئی جس میں ٹریڈ یونینوں کی عالمی فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس فیڈریشن میں ۵۶ ممالک کی ٹریڈ یونینوں کو شامل کیا گیا جن میں سوویت یونین، امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی، پولینڈ، چین، ہندوستان اور انڈونیشیا بھی شامل تھے، جو سات کروڑ محنت کشوں کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ (۱۹۸۲ء میں اس فیڈریشن کی دسویں کانگریس میں ۱۳۸ ممالک کی ٹریڈ یونین تنظیموں نے حصہ لیا جن کے ممبران کی تعداد ۲۷ کروڑ سے تجاوز کر رہی تھی)۔

سرمایہ دار ممالک کی حکومتوں میں کمیونسٹوں کی شمولیت کی وجہ سے مزدور طبقہ

اپنے بہت سے جمہوری حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ فرانس اور اٹلی میں نئے اور زیادہ جمہوری آئین کی منظوری سے اجارہ دار سرمائے کے خلاف جدوجہد کے نئے امکانات واضح ہوئے۔ مزدور تحریک بورژوازی سے بہت سی معاشی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہی جن میں اُجرتوں میں اضافہ، سوشل سیکورٹی اور بہتر حالاتِ کار جیسے مطالبات شامل تھے۔ چند ممالک میں بعض صنعتوں کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ برطانیہ میں کوئلے کی صنعت بجلی گھر اور چند اسٹیل ملز کو قومیا لیا گیا جس سے برطانیہ کی ۲۰ فیصد صنعت قومی ملکیت میں آگئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بورژوازی نے قومی ملکیت میں لی گئی صنعتوں کو اپنے محدود مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہا لیکن اس مسئلے پر اُنہیں مزدور طبقے کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

ان تمام کامیابیوں کے باوجود پرولتاریہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ سرمایہ داری نظام کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں دوررس تبدیلیاں لانے کا اہل ہوسکے۔ سوشل ڈیموکریٹک رہنماؤں کی غیر مستقل مزاجی، متضاد پالیسیوں، اجارہ دار بورژوازی کے خلاف موثر اقدامات اٹھانے سے انکار، طبقاتی مفاہمت کی طرف جھکاؤ اور کمیونسٹ دشمنی کی پالیسیوں کے نتیجے میں حکمران طبقات کو اپنی پوزیشن مستحکم کرنے اور سیاسی پیش قدمی اپنے ہاتھ میں لینے کا موقع ملا۔ جہاں معاشی میدان میں بورژوازی کو اقتدار کی اصل طنابیں حاصل ہوئیں وہیں اُسے یہ موقع بھی ملا کہ اُس نے معاشی سدھار کی پالیسی کو استعمال کرتے ہوئے جدوجہد کی انقلابی شکلوں کو غیر ضروری قرار دیا اور اس نظریے کا پرچار کیا کہ سرمایہ داری سماجی مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ سامراجی سرمائے کی ان تدابیر کا مقصد مزدور طبقے کو تقسیم کرنا اور مزدور تنظیموں کے انقلابی امکانات کو کمزور کرنا تھا۔ یہ تمام اقدامات اُس وقت اٹھائے جارہے تھے جب ایک طرف تو سرد جنگ کو ہوا دی جارہی تھی اور دوسری جانب سوویت یونین کے خلاف زہر اُگلا جارہا تھا اور کمیونسٹ دشمنی کا جنون پھیلایا جارہا تھا۔

سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے درمیان خلیج کو وسیع تر کرنے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔

ان مقاصد کے حصول میں دایئں بازو کے سوشلسٹ رہنما معاون ثابت ہوئے۔ سوشل ڈیموکریٹک تحریک میں دایئں بازو کے رجحانات کے زور پکڑنے سے سرمایہ دار ممالک میں مزدور تحریک کی ترقی پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں ورلڈ فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز میں پھوٹ پڑ گئی اور اس کے دو ہی سال بعد سوشلسٹ انٹرنیشنل کا احیاء عمل میں آیا جس میں کمیونسٹ دشمنی نمایاں تھی۔ کمیونسٹوں کی جانب یہ منفی رجحان ریاستی اجارہ دار سرمایہ داری کو مضبوط کرنے کا باعث بنا۔ بورژوازی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہڑتالی تحریک میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور اُسے "سماجی پارٹنر" بنانے کی راہ ہموار کرنے لگیں۔

بہر کیف طبقاتی جدوجہد میں یہ ٹھہراؤ وقتی ثابت ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں پلنے والے تضادات اس نئی صورتحال میں پھر سے شدید ہونے لگے۔ نہ تو سرمایہ دارانہ نظام کو بہتر طور پر چلانے کے لئے معیشت میں ریاستی مداخلت اور نہ ہی حکمران طبقات کی جانب سے سماجی جوڑ توڑ کی حکمت عملی ان تاریخی قوانین کے تسلسل میں مانع ہو سکی، جس کے تحت یہ نظام اپنے منطقی نتیجے تک پہنچ رہا تھا۔ اس نئی تاریخی صورتحال میں متعدد یورپی ممالک کی مزدور پارٹیوں نے سوشلزم کی جانب بڑھنے میں جدوجہد کی نئی اشکال وضع کرنے کی کوشش کی اور مستقل مزاجی سے مزدور تحریک اور تمام سامراج مخالف قوتوں کے درمیان اشتراک کی راہیں تلاش کرنے پر زور دیا۔ اجارہ دار سرمایہ داروں کے خلاف مزدور طبقے کی جدوجہد اور غیر پرولتاری پرتوں مثلاً دیہات کے چھوٹے کسانوں اور شہروں میں درمیانے درجے کے طبقات کے درمیان مشترکہ مفادات معروضی طور پر قائم ہو رہے تھے جس کے نتیجے میں مزدور طبقے اور عوام کے وسیع تر حصوں کے درمیان سوشلزم اور جمہوریت کے لئے اتحاد کے نئے امکانات روشن ہو رہے تھے۔ عوام کے وسیع تر حصوں سے اتحاد کرتے وقت صحیح مارکسی لینی کبھی بھی اپنی آزادانہ اور طبقاتی پالیسیوں سے انحراف نہیں کرتے۔ وہ پیٹی بورژوا پرتوں کی موقع پرستی اور

تجرویوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور مزدور طبقے کے ہراول دستے کو وسیع تر سیاسی اتحادوں میں ضم کرنے کی تمام تر کوششوں کا سختی سے مقابلہ کرتے ہیں۔

جنگ کے بعد کی دو دہائیوں کی پوری مدت میں سامراجی نظام کے ارتقاء میں مجموعی حیثیت سے اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سوشلسٹ ممالک کی بڑھتی ہوئی معاشی اور فوجی طاقت، قومی آزادی کی تحریک کی زبردست کامیابیاں اور عالمی امن کے لئے جدوجہد جیسے عناصر نے اُن مواقع کو محدود کر دیا جو ابھی تک سامراجی ریاستوں کے سامنے کھلے ہوئے تھے اور عالمی واقعات کی روش کا تعین کرنے میں اُن کی صلاحیت پر پابندی لگا دی۔ سرمایہ دار ممالک میں طبقاتی جنگ اور دیگر سماجی تضادات تیز تر ہونے گئے اور ان تمام عناصر کے ساتھ ساتھ معاشی صورتحال کی ابتری نے چھٹی دہائی کے نصف آخر میں سرمایہ داری کو شدید ترین بحران میں مبتلا کر دیا۔

۱۹۶۸ء کی بہار میں فرانسیسی معاشرے کے اندر پلنے والے تضادات پھٹ پڑے اور انہوں نے ایسے طبقاتی تنازعہ کی صورت اختیار کر لی جیسا کہ فرانس میں برسوں سے نہیں ہوا تھا۔ مئی اور جون ۱۹۶۸ء میں محنت کش طبقہ فرانس کی سیاسی زندگی میں اہم ترین عنصر بن چکا تھا، جس کی منظم قوت کا اظہار دو بنیادی سمتوں میں تھا۔ پرولتاریہ کے اپنے مفادات کی جدوجہد اور ان طالب علموں کے مطالبات کی حمایت جو پولیس تشدد کا نشانہ بنے تھے۔ اس تحریک کا نقطہ آغاز سوربون یونیورسٹی میں طلبہ کے ایک جلسے سے ہوا جس میں پولیس نے تشدد کا بہیمانہ مظاہرہ کیا۔ تحریک کے آغاز ہی میں مزدوروں نے بیسیوں کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔ اس تحریک کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ تقریباً ایک کروڑ ہڑتالیوں نے فوری معاشی مطالبات کے ساتھ ساتھ اجارہ داروں اور اُن کی ریاستی طاقت کے خلاف پر زور مظاہرے کئے۔ یہ تحریک سماجی، معاشی اور سیاسی میدانوں میں گہری دور رس جمہوری اصلاحات کا مطالبہ کر رہی تھی۔ ہڑتالی کمیٹیوں نے انتظامیہ کے بہت سے فرائض سنبھال لئے جن میں شہروں میں

داخلہ اور خروج اور ایسے کریڈٹ بونڈز کا اجراء شامل تھا، جنہیں کسان اور دوکاندار پیسے کے طور پر قبول کرتے تھے۔ کسانوں کے ساتھ اجناس کے براہ راست تبادلے کے بھی انتظامات کیے گئے۔

اس صورتحال میں اتحاد کی ضرورت نہ صرف نچلی سطح پر تھی بلکہ بائیں بازو کی مزدور تنظیموں کے رہنماؤں میں بھی اتحاد ناگزیر تھا۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی کی مسلسل کوششوں کے باوجود بائیں بازو اور اصلاح پسند ٹریڈ یونینوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا نہیں کیا جا سکا۔ مئی ۱۹۶۸ء کے ان پرآشوب واقعات کے دوران بائیں بازو کے انتہا پسندوں، جن میں ٹراٹسکی نواز پیش پیش تھے، نے کمیونسٹوں کی حکمت عملی پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی، ان کے مطابق کمیونسٹ "کافی انقلابی جذبہ" نہیں رکھتے تھے۔ طاقت گلیوں میں بکھری پڑی تھی اور کوئی بھی اسے اٹھا سکتا تھا۔ لیکن صورتحال اس کے برعکس تھی۔ بائیں بازو کے انتہا پسندوں کے دعووں کے برخلاف قوتوں کا جو توازن موجود تھا، اس میں سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کا سوال ابھی سرفہرست نہیں تھا۔ دوسری جانب یہ عین ممکن تھا کہ ڈیگال کو طاقت سے برطرف کر کے حقیقی معنوں میں ایک ترقی یافتہ جمہوری ریاست قائم ہو جاتی جو سوشلزم کی جانب جانے کی راہ ہموار کرتی۔ لیکن ان امکانات کو حقیقت میں ڈھالنے کے لئے محنت کشوں اور دوسری جمہوری قوتوں کے درمیان اتحاد ناپید تھا۔ حکمران طبقات کی جانب سے سول جنگ کی تیاریاں جو فوج اور پولیس کو اپنے کنٹرول میں رکھنے میں کامیاب رہے تھے، اور بائیں بازو کے درمیان اتحاد کے فقدان نے اس طاقتور تحریک کو آدھے راستے میں روک دیا اور اسے سماجی بحران کی جڑوں تک نہیں پہنچنے دیا۔

اٹلی میں بھی صورتحال زیادہ فرق نہیں تھی۔ مزدور طبقہ بورژوا ریاست کے دائرہ کار میں آنے والے بہت سے شعبوں میں مداخلت کرنے لگا تھا اور بجٹ میں قومی آمدنی کے ایک بڑے حصے کو سماجی ضرورتوں کی جانب منتقل کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اب محنت کشوں کی تنظیموں

کو جو فریضہ درپیش تھا وہ یہ تھا کہ آیا یہ رقم محنت کشوں پر مزید ٹیکس نافذ کرنے سے تو نہیں آ رہی۔ اب ٹریڈ یونین فنڈ باقاعدگی سے اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے کاٹ لئے جاتے تھے اور ٹریڈ یونینوں کے حساب میں منتقل کر دیئے جاتے تھے جس سے ٹریڈ یونینوں کی لڑاکا صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے۔

لیکن مختلف ممالک میں پرولتاریہ کا طبقاتی شعور اور اُن کی جدوجہد کی شدت ایک جیسی نہیں ہے۔ اس کا انحصار کسی خاص ملک میں قوتوں کے حقیقی توازن اور تاریخی ارتقاء کی خصوصیات پر ہے۔ فرانس اور اٹلی جیسے ممالک میں جہاں پر سیاسی اور سماجی تضادات انتہائی شدید ہیں، مزدور اور جمہوری تحریک میں کمیونسٹ پارٹیاں رہنما کردار ادا کرتی ہیں۔ جبکہ مغربی جرمنی، برطانیہ اور سکینڈے نیویا میں طبقاتی جدوجہد دوسری شکلیں اختیار کر رہی ہے۔ مختلف وجوہات کی بناء پر یہاں سماجی اصلاح پسندی کا رنگ نمایاں ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے سامراجی ملک امریکہ میں مزدور تحریک کے خدوخال قطعی مختلف ہیں جہاں پر محنت کشوں کا مقابلہ دنیا کے شاطر اور طاقتور ترین سامراجی سرمائے سے ہے۔ بہت سی تاریخی وجوہات کی بناء پر امریکہ میں مزدور تحریک نظریاتی اور سیاسی اعتبار سے کافی کمزور ہے امریکہ میں دیگر ممالک کے برعکس بورژوا اصلاح پسندی کا رجحان غالب رہا ہے جہاں پر کوئی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی تک وجود نہیں رکھتی۔

ایشیا اور افریقہ میں مابعد جنگ انقلابی جدوجہد

سرمایہ داری کے نوآبادیاتی نظام، جس نے ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں صدی میں جنم لیا۔ نے پوری دنیا کو معاشی طور پر جوڑنے کے ساتھ ساتھ اُس میں تفریق بھی ڈال دی۔ ایک طرف تو مٹھی بھر سرمایہ دار ممالک تھے تو دوسری طرف استحصال زدہ محکوم عوام کی افواج تھیں۔ نوآبادیاتی تسلط نے ایشیاء اور افریقہ کے بیشتر حصوں میں پیداواری قوتوں کو تہس نہس کر دیا اور غلام محنت کو رواج دیا۔ بورژوا نظریہ دان یہی ثابت کرتے رہے کہ نوآبادیاتی

نظام ایشیا اور افریقہ کی معاشی اور سماجی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ مارکس اور اینگلز نے ان دعووں کی کلی کھولی اور سرمایہ دار ممالک کے مزدوروں پر زور دیا کہ وہ محکوم عوام کی جدوجہد آزادی کی بھرپور حمایت کریں اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام پر کاری ضرب لگائیں جس سے دنیا بھر کے مزدوروں کی تحریک آگے بڑھے۔

استعماری مقبوضہ ممالک میں جنگ کے دوران جو صورتحال پیدا ہو گئی تھی وہ ایسی تھی کہ اب ایک وسیع قومی محاذ آزادی کی تشکیل بالکل ممکن ہو گئی تھی۔ بعض ملکوں میں اس طرح کے محاذ نے ایک منظم صورت اختیار کر لی اور بعض میں اس کا فی الواقعہ وجود تھا۔ نوآبادیاتی ممالک کی آبادی کے سارے طبقوں کو آزادی حاصل کرنے سے دلچسپی تھی۔ رجعت پرستوں کا ایک محدود حصہ ہی اس کا مخالف تھا جسے اُن معاشی فوائد و مراعات کھو دینے کا ڈر تھا جو اُس نے استعماری آقاؤں کی خدمت کر کے حاصل کئے تھے۔ سامراج دشمن جدوجہد کی نوعیت اور قومی آزادی کے انقلابوں کی صورتوں کا دارومدار سب سے زیادہ اس بات پر تھا کہ کون سا سماجی طبقہ اس کی قیادت سنبھالتا ہے۔ جنگ سے پہلے یا جنگ کے دوران جہاں بھی حالات سازگار تھے (مثلاً چین، شمالی کوریا اور شمالی ویتنام) وہاں قومی آزادی کی تحریک کی قیادت مزدور طبقے کے ہاتھوں میں رہی اور وہاں سامراج دشمن جدوجہد نے عوامی جمہوری انقلابوں کی شکل اختیار کی۔ وہ ممالک جہاں آزادی کی تحریک کی قیادت قومی بورژوازی کے ہاتھوں میں تھی، ایک واحد قومی محاذ کی تشکیل کافی دقت طلب اور طویل عمل تھا۔ ایسی صورتوں میں تنظیم بڑھتی ہوئی جدوجہد آزادی کے مقابلے میں پیچھے رہ گئی تھی۔

انڈونیشیا

دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے تک انڈونیشیا میں تحریک مزاحمت کا نہ تو کوئی مرکز تھا اور نہ ہی ملک گیر مسلح بغاوت کی رہنمائی کے لئے کوئی پروگرام تھا۔ مختلف سیاسی میلانات کی خفیہ تنظیمیں آبادی میں، طالب علموں میں اور مسلح افواج کے سپاہیوں میں کام کرتی

تھیں۔ اگست ۱۹۴۵ء میں جب جاپان کی شکست ایک طے شدہ حقیقت بن چکی تھی تو سوکارنو نے عوام کی جانب سے عمل کرتے ہوئے انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان کردیا۔

لیکن برطانیہ اور ہالینڈ نے عوام کی مرضی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے انڈونیشیا میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ سخت مشکلات میں جنگ لڑتے ہوئے جمہوریہ نے اپنا تنظیمی کام بھی جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ ٹریڈ یونینیں نئے سرے سے قائم ہونے لگیں اور جلد ہی ایک ٹریڈ یونین مرکز قائم کردیا گیا۔ کسان تنظیمیں نمودار ہونے لگیں۔ سیاسی پارٹیاں روپوشی سے باہر آنے لگیں۔ انڈونیشیائی کمیونسٹ پارٹی تعداد کے اعتبار سے بہت چھوٹی تھی کیونکہ بیشتر کمیونسٹ جنگ کے دوران مارے گئے تھے۔ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ روپوش ہی رہے گی اور اپنا قانونی کام سوشلسٹ پارٹی اور مزدور پارٹی کے ذریعے کرے گی۔

سامراجی طاقتوں کی جانب سے جمہوریہ کو ختم کرنے کیلئے اپنے قبضے میں واقع علاقوں میں کٹھ پتلی ریاستیں قائم کرنے کا عمل شروع ہوا۔ ان حالات میں سوشلسٹ پارٹی، مزدور پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کو متحد کردیا گیا اور اس تنظیم کے ذمے یہ فریضہ سپرد کیا گیا کہ وہ مزدور طبقے کی رہنمائی میں ایک متحدہ قومی محاذ قائم کرے۔ اس دوران ان سے بائیں بازو کی تنگ نظری والی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں جن سے انہیں کافی نقصان پہنچا۔ رجعت پرست عناصر نے اشتعال انگیزی کرکے ترقی پسندوں کے خلاف دہشت کی ایک مہم شروع کردی جس میں کمیونسٹ پارٹی کے بیشتر رہنما جان سے مارے گئے۔ خود پارٹی نیم قانونی بنیاد پر محنت کشوں کو منظم کرنے کی کوششیں کرتی رہی۔

بین الاقوامی دباؤ اور عوامی تحریک آزادی نے انڈونیشیا کو تقسیم کرنے کی سامراجی سازشوں کو نیست و نابود کردیا۔ لیکن ملک میں ترقی پسند عناصر کی حیثیت ابھی تک مضبوط نہیں تھی اور رجعت پرست قوتوں کا زور ابھی باقی تھا۔ رجعت پرست قوتوں کی حمایت میں فوجی گروہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا اثر خاص طور پر اس وقت بڑھنے لگا

جب جنگ کے دوران فوج نے اپنی تحفظاتی کے علاقوں میں قومی ملکیت بنائی جانے والی غیر ملکی جائیداد کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔ ریاستی مشینری میں فوج کا کردار بڑھتا گیا۔

انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی کے چند رہنماؤں نے "ہر وقت اور ہر جگہ مسلح جدوجہد" کے نعرے کی رو میں بہہ کر چند ترقی پسند فوجی افسروں کے ساتھ مل کر رجعت پسند جنرلوں کے اقتدار کو بزور طاقت الٹنے کی کوشش کی۔ یہ قدم ایسے وقت میں اٹھایا گیا جب عوام اس بارے میں قطعی بے خبر تھے۔ لینن نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ انقلاب عوام کا اپنا سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے اور اُن کی پس پشت انقلاب برپا نہیں کئے جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کوشش کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ بغاوت کو تو جلد ہی دبا دیا گیا لیکن رجعتی قوتوں نے اس واقعہ کو بہانہ بناتے ہوئے پورے ملک میں کمیونسٹ دشمنی کی وحشیانہ مہم چلادی جس میں تین لاکھ کمیونسٹوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا اور پچیس لاکھ ممبروں پر مشتمل مزدور طبقے کی ہراول پارٹی اپنی قیادت اور فعال اراکین سے محروم ہوتے ہوئے انتشار کا شکار ہو گئی۔ انڈونیشیائی بورژوازی، بڑے زمینداروں اور فوج نے عام ظلم و جبر، گرفتاریوں اور دھمکیوں کی مدد سے مجمع الجزائر پر کنٹرول قائم کر لیا۔ مزدوروں اور محنت کش کسانوں کو اُن تمام مراعات سے محروم کر دیا گیا جو انہیں ترقی پسندوں کی مدد سے حاصل ہوئی تھیں۔ بیرونی اجارہ داریاں پھر سے سرگرم عمل ہوئیں اور مقابلے کی سکت نہ رکھنے والے ملکی کارخانوں کو بند کیا جانے لگا۔

ہندوستان

۱۹۳۹ء کی خزاں میں کانگریس نے اعلان کیا کہ جنگ میں برطانیہ کے لئے ہندوستان کی حمایت کی اوّلین شرط یہ ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو مکمل خودمختاری دینے پر رضامند ہو۔ جب برطانوی حکومت نے اس مطالبے پر پس و پیش سے کام لیا تو پورے ملک میں جنگ کے خلاف مظاہروں، ہڑتالوں اور دوسرے اقدامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب جرمنی نے سوویت یونین پر بھی حملہ کر دیا تو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے ہٹلر دشمن اتحاد کی جنگی کوششوں کی پوری

پوری حمایت کرنے کے لئے اپیل جاری کی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے امکانات جمہوری قوتوں کی فتح سے قریبی طور پر وابستہ تھے۔ اتحادیوں کی حمایت کرنے پر برطانوی حکومت نے کمیونسٹ پارٹی سے پابندی اٹھالی جس سے پارٹی کے لئے محنت کش طبقات کو منظم کرنے کا زبردست موقع ہاتھ آیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اتحادیوں کی حمایت اور ہندوستانی عوام کی جدوجہد آزادی میں مناسب جدلیاتی رشتہ قائم کرنے میں ناکام رہی جس سے بورژوازی کو اس تحریک پر اپنی قیادت مسلط کرنے میں آسانی ہوئی۔ کانگریس جنگ کے پورے عرصے میں انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کے حق میں رہی۔

بہرحال جنگ کے ختم ہونے تک کمیونسٹ سنبھل چکے تھے اور انہوں نے مزدوروں کی بے مثال ہڑتالوں کی رہنمائی کی جنہوں نے اکثر سیاسی رنگ اختیار کیا۔ ۱۹۴۶ء کے آغاز تک کسانوں کے سامراج دشمن اور جاگیردار دشمن اقدامات بھی بڑھ گئے۔ برطانیہ اب ہندوستان پر من مانی حکومت چلانے کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔ انگریزوں کو سامراج دشمن تحریک پر قابو پانے اور اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کا واحد طریقہ یہی نظر آیا کہ ہندوستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کردیا جائے۔ یہ تقسیم مذہبی بنیادوں پر ہوئی جس میں بے مثال پیمانے پر قتل اور غارتگری ہوئی۔ ترقی پسند عناصر اور سب سے بڑھ کر باشعور محنت کشوں نے خونریزی کو روکنے اور ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کی انتھک کوشش کی لیکن اس کے باوجود لاکھوں افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

جب ہندوستان آزاد ہوا تو یہاں قومی بورژوازی برسراقتدار تھی اور اس نے نہ صرف ہندوستان کی نئی حاصل شدہ آزادی کو یقینی بنانے کا بلکہ خود اپنی غالب حیثیت کو مضبوط تر بنانے کا بیڑہ اٹھا رکھا تھا۔ دوسری طرف محنت کش عوام اپنی سرگرمی بڑھا رہے تھے۔ ۱۹۵۷ء کے انتخابات میں کمیونسٹ پارٹی کو ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ووٹ ملے۔ کیرالا میں کمیونسٹ اکثریت میں تھے اور یہاں انہوں نے ریاستی حکومت کی تشکیل کی۔ ملک کی مجموعی

صورتحال اور عوام الناس میں اپنا اثر برقرار رکھنے کی خواہش نے کانگریس کے لئے لازمی بنا دیا کہ وہ جاگیرداروں اور راجواڑوں کی حیثیت کو کمزور کرنے کی پالیسی پر عمل کرے۔ لیکن یہ عمل کافی سست رفتار تھا۔ ہندوستانی بورژوازی کی کمزوری اور بھاری صنعت میں سرمایہ لگانے سے اُن کی ہچکچاہٹ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکومت نے ایک نسبتاً طاقتور پبلک سیکٹر قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکمراں پارٹی نے نہرو کی سرکردگی میں ہندوستان میں "سوشلسٹ طرز کا سماج" قائم کرنے کو اپنا مقصد قرار دیا۔ یہ قرارداد عوام الناس میں سوشلزم کی طرف بڑھتے ہوئے جھکاؤ کی آئینہ داری کرتی تھی لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہندوستانی حکمران طبقات جب سوشلزم کی بات کرتے تھے تو اُن کا مطلب ہوتا تھا ہندوستانی سرمایہ داری کا ارتقا جس میں ریاستی سیکٹر پر زیادہ زور ہو۔ ہندوستان کو سوشلسٹ برادری سے جو امداد ملی اس سے اُس نے صنعتی ارتقا میں خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

۱۹۶۷ء کے اوائل میں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے لئے عام انتخابات نے شدید تر طبقاتی تضادات کی عکاسی کی۔ کمیونسٹوں کی سرکردگی میں مغربی بنگال، بہار، پنجاب وغیرہ میں بائیں بازو کے متحدہ محاذ کی حکومتیں بن گئیں۔ لیکن اس سے پہلے ۱۹۶۱ء میں قومی بورژوازی کی جانب رویّے اور روس چین تنازعے کے مسئلے پر کمیونسٹ تحریک میں پھوٹ پڑ چکی تھی اور دو کمیونسٹ تنظیمیں وجود میں آ چکی تھیں۔

مصر

جب جنگ ختم ہوئی تو ملک میں ایک عام تحریک پھیل گئی جس کا مطالبہ تھا کہ برطانوی فوجوں کو فوراً ہٹا یا جائے۔ مزدور، کسان، دستکار اور پیٹی بورژوازی قومی تحریک میں سرگرم حصہ لے رہے تھے۔ عوام میں وفد پارٹی سب سے زیادہ مقبول تھی لیکن اس کے اندر ایک مضبوط دایاں بازو بن گیا جو بڑی بورژوازی اور زمینداروں کے مفاد کی نمائندگی کرتا تھا۔ مزدور طبقہ ابھی اتنا بالغ نہیں تھا کہ آزادی کی جدوجہد کی سربراہی کر سکے اور نہ کمیونسٹ اس

لائق تھے کہ جس جبر و استبداد اور دہشت سے وہ دوچار تھے اُس کے سامنے اپنی تنظیم برقرار رکھیں۔ ۱۹۵۲ء میں مصری عوام کی قومی آزادی کی جدوجہد ایک نئے اور فیصلہ کن دور میں داخل ہوئی۔ نہر سوئیز کے علاقے میں چھاپہ مار جنگ، عام مظاہرے اور ہڑتالیں اس بات کا واضح ثبوت تھیں کہ انقلاب زور پکڑ رہا ہے۔ لیکن مزدور طبقے کی کمزوری کے ساتھ ساتھ قومی بورژوازی بھی پس پیش میں تھی۔ ایک طرف تو وہ استعماریوں کو نکالنے میں دلچسپی رکھتی تھی تو دوسری طرف عوامی انقلاب کے امکان سے خوفزدہ تھی۔ اس سیاسی فضا میں بورژوازی نے فوجی افسران سے اُمید لگانی شروع کی جو یا تو پیٹی بورژوازی سے یا کسان طبقے کی خوشحال پرت سے تعلق رکھتے تھے اور ابھی اس بات پہ واضح نہیں تھے کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد ملک کا ارتقاء کون سی نہج اختیار کرے گا۔

جولائی ۱۹۵۲ء میں "آزاد افسروں" کی انجمن نے پوری مصری فوج کی حمایت سے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور مصر کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اگر معروضی طور پر دیکھا جائے تو یہ مصر کو ایک آزاد سرمایہ دارانہ ریاست بنانے کی جدوجہد تھی۔ نہر سوئیز کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد بیرونی بنکوں اور کارخانوں کو ضبط کرنے سے بڑی بورژوازی کے مورچے اور بھی مضبوط ہو گئے تھے۔ وہ اجارہ دار سرمائے کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے پر تلا ہوا تھا اور اس نے ناصر حکومت کی پالیسی کے بعض پہلوؤں کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ناصر اور اُس کے پیروؤں نے جب یہ محسوس کیا کہ ملک کی آزادی جو اتنی مشکلوں سے حاصل کی گئی ہے خطرے میں ہے تو انہوں نے عام حمایت پر بھروسہ کرتے ہوئے ایسی اصلاحات کرنے کا فیصلہ کیا جن کا مقصد بڑی بورژوازی کے معاشی و سیاسی مورچوں کو کمزور کرنا تھا۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں ۱۹۶۴ء تک حکومت نے سارے بنکوں، بیمہ کمپنیوں اور بڑے و متوسط صنعتی کارخانوں کی اکثریت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا جس سے ملک کی صنعتی پیداوار کا ۹۰ فیصد حصہ اور تقریباً ساری بیرونی تجارت حکومت کے ہاتھ میں آ گئی۔ حکومت نے سات گھنٹوں کے کام کے دن، اُجرتوں کی معین شرح

چھٹیوں اور سماجی بیمے کے بارے میں قوانین منظور کیے۔ مزدوروں اور ملازمین کے نمائندوں کو کارخانوں کی انتظامی کونسلوں میں شریک کیا گیا۔ زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں اور لگان پر زمین دینے کے نظام پر سخت وار کیے گئے۔ لیکن اس کے باوجود مصر کی زراعت میں ذاتی ملکیت کے رشتے رائج رہے۔ کسانوں کی بڑی تعداد کے پاس اب بھی زمین نہیں تھی اور بیروزگار کھیت مزدوروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی۔

۱۹۶۴ء میں ایک عارضی آئین نافذ کیا گیا جس نے ملک کے ایک ایسے جمہوری سوشلسٹ ریاست ہونے کا اعلان کیا جس کی بنیاد قوم کے کسانوں، مزدوروں، دانشوروں اور قومی بورژوازی کے اتحاد پر ہے۔ لیکن اس سارے عمل کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ سماجی اور معاشی اصلاحات پیمانے اور رفتار کے اعتبار سے ملک میں لائی جانے والی سیاسی تبدیلیوں سے کہیں آگے تھیں۔ جب جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے مصر پر حملہ کرتے ہوئے اس کے علاقوں غازہ اور جزیرہ نمائے سینائی پر قبضہ کر لیا تو صدر ناصر کو اپنے اختیارات سے دستبردار ہونا پڑا۔ عوام کے پرزور اصرار پر وہ مزید چند سال اپنے عہدے کو برقرار رکھنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن اُن کی وفات کے بعد سادات کا اقتدار میں آنا اور ملک کو دوبارہ سرمایہ دارانہ ترقی کے راستے پر لے جانا اس کا واضح ثبوت تھا کہ جمہوریہ کے اعلیٰ فوجی افسران فوجی افسر شاہی کی ایک صاحب مراعات پرت بن گئے تھے اور انہیں جمہوریہ کے مزید غیر سرمایہ دارانہ ارتقا سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ مزید براں اس عرصے میں درمیانی بورژوازی اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ وہ اپنے پھیلاؤ پر حدود لگانے کے خلاف سخت ردعمل کا اظہار کرنے لگی تھی۔ اس صدی کی ساتویں دہائی میں رونما ہونے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ۱۹۵۲ء کا انقلاب بڑی حد تک اوپر سے عائد کیا گیا تھا اور محنت کش عوام نے اس میں وسیع پیمانے پر شرکت نہیں کی تھی۔

الجزائر

جنگ عظیم کے برسوں میں فرانسیسی تحریک آزادی کا ہیڈ کوارٹر الجیریا میں قائم ہوا

تھا جس سے الجیریائی عوام میں قومی خود آگاہی کی نشو و نما تیز ہوگئی اور جنگ کے بعد کے اوّلین برسوں ہی میں فرانس سے فوری آزادی کے مطالبے کے لیے پورے ملک میں مظاہرے ہوئے، جس کی سربراہی مزدور طبقہ کر رہا تھا۔ تنظیم کی کمی اور ہتھیاروں کی نایابی کی وجہ سے اس تحریک کو تشدد سے کچل دیا گیا۔

۱۹۵۴ء میں انقلابی کمیٹی برائے اتحاد و عمل نے الجیریائی عوام سے آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کرنے کی اپیل کی جو بتدریج ایک عوامی سامراج دشمن انقلاب میں تبدیل ہوئی۔ انقلابی کمیٹی میں رہنمایانہ رول انقلابی دانشوروں کو حاصل تھا جو خاص طور سے کسان طبقے سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ فرانسیسیوں نے اس کے جواب میں پورے الجیریا میں دہشت کی حکمرانی قائم کر دی۔ جنگ آزادی ۱۹۶۲ء تک جاری رہی جس کے نتیجے میں فرانس کو مجبوراً ملک میں عام رائے شماری کا مطالبہ ماننا پڑا، جس نے آزادی کے حق میں متفقہ فیصلہ کر دیا اور الجیریا ایک آزاد ریاست بن گیا۔

جنگ اور خفیہ مسلح تنظیم کے دہشت پسندانہ طریقہ کار نے ملک کو بالکل برباد کر دیا تھا اور فرانسیسی اپنے کاروبار اور فارم چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ اسی وقت مزدوروں نے خود اپنی پیش قدمی پر ان کارخانوں اور فارموں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا اور ان میں "خود انتظامی کمیٹیاں" قائم کر دیں، جس سے قومی بورژوازی کے اُن اندازوں کو سخت ٹھیس پہنچی جن کے مطابق استعماریوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد اُن کے ہاتھ میں آتی تھی۔ انقلاب کو جاری رکھنے کے لیے اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ تمام ترقی پسند قوتوں کو متحد کیا جائے اور ایک پارٹی منظم کی جائے جو محنت کش عوام کی حملہ آور قوت ہو اور ایک آزاد الجیریا کے لیے قیادت فراہم کرے۔

قومی محاذ آزادی کی کانگریس جو ۱۹۶۴ء میں منعقد ہوئی، نے جو منشور منظور کیا تھا اُس کے مطابق خود انتظامی قومی عوامی انقلاب سے سوشلسٹ انقلاب کی طرف عبور کے مسلسل عمل کا اظہار ہے۔ ۱۹۶۵ء تک الجیریائی معیشت کا خود انتظام کردہ سیکٹر ساری قابل کاشت زمین کے

۴۰ رفیصد حصّے اور صنعتی پیداوار کے ۲۰ رفیصد حصّے پر مشتمل تھا۔ جب سے الجیریا نے غیر سرمایہ دارانہ ترقی کا پروگرام شروع کیا ہے تبھی سے ملک میں طبقاتی جنگ شدید تر ہوگئی ہے اور دائیں بازو کے عناصر اکثر طاقت استعمال کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن قومی محاذ آزادی نے جو ترقی پسند سماجی، معاشی اور سیاسی اصلاحات نافذ کی تھیں اُنہیں الجیریائی عوام کی سرگرم حمایت حاصل ہے۔

ساتویں اور آٹھویں عشروں کے آغاز میں ایشیا و افریقہ کی قومی آزادی کی تحریک عملاً جاگیردار اور سرمایہ دار بالخصوص اجارہ دار سرمایہ دار طبقے کے خلاف جدوجہد میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ایسے ملکوں کی تعداد اب بڑھتی جارہی ہے جہاں پر قومی آزادی کی جدوجہد کا غالب رجحان غیر سرمایہ دارانہ راہ کی طرف ہے۔ اس سلسلے میں انگولا، ایتھوپیا، موزمبیق، جمہوریہ یمن، لاؤس، کمپوچیا اور افغانستان کی جدید مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ترقی کے غیر سرمایہ دارانہ راستے پر گامزن ہونے والے ممالک میں اقتدار کے انقلابی ہونے کی سب سے اہم شرط ترقی پسند داخلی وخارجہ پالیسیوں میں واضح سامراج دشمن رجحان کی موجودگی ہے۔ جاگیردارانہ اور بڑی سرمایہ دارانہ ملکیت کا خاتمہ اور کسانوں میں زمین کی تقسیم کے لیے زرعی اصلاحات کرنا، صنعت میں سرکاری شعبے کو جمہوری رنگ دینا اور اُسے معیشت کے بنیادی شعبے میں تبدیل کرنا اور انفرادی سرمایہ کاری کو محدود کرنے کے لیے معاشی منصوبہ بندی کا وسیع استعمال، عوام کے معاشی اور مادی معیار کو بلند کرنا، سماجی و سیاسی زندگی کو جمہوری رنگ دینا اور محنت کشوں کے وسیع حلقوں کیلئے ریاستی کاموں میں شرکت کے لیے مواقع فراہم کرنا، یعنی محنت کشوں کے مفاد میں مسلسل جمہوری اصلاحات نافذ کرنا، یہ سب ان ممالک کی ترقی پسند اندرونی سیاست کے اہم پہلو ہیں۔

لیکن چونکہ معیشت میں ریاستی اور نجی شعبہ ساتھ ساتھ قائم رہتے ہیں لہٰذا قومی بورژوازی کو ملک کی سیاست اور ترقی پر اثر انداز ہونے کے مواقع حاصل رہتے ہیں اس لئے غیر سرمایہ دارانہ

راستے پر ترقی کے دوران شدید طبقاتی لڑائی جاری رہتی ہے ۔ اور اسوقت تک جب تک کہ مزدور طبقہ دوسری انقلابی قوتوں کے ساتھ مل کر غلبہ حاصل نہیں کر لیتا، ملک میں غیر سرمایہ دارانہ راستے یا سوشلسٹ رجحان سے ہٹنے کے خطرات موجود رہتے ہیں ۔

لاطینی امریکہ میں مابعد جنگ انقلابی جدوجہد

دوسری جنگ عظیم کے دوران ریاستہائے متحدہ امریکہ نے لاطینی امریکہ کے ممالک کے اندر اپنے معاشی اور فوجی رسوخ میں بے پناہ توسیع کر لی تھی ۔ جب جنگ ختم ہوئی تو اس براعظم پر امریکہ کے ۹۲ فوجی اڈے تھے ۔ امریکی اجارہ داریوں نے ان ممالک کی بیرونی تجارت میں غالب حیثیت حاصل کر لی تھی اور انہیں مالی دست نگری کے جال میں پھنسا لیا تھا ۔ امریکی اجارہ داروں نے لاطینی امریکی ملکوں میں قومی صنعتوں کے ارتقاء کو روکنے کی بھرپور کوشش کی ۔ امریکی سامراجیوں نے ان ممالک میں بالخصوص گوئٹے مالا، ڈومنیکن ری پبلک اور بولیویا میں رجعت پرست مطلق العنانیت کی بھرپور امداد کی ۔

یورپی سرمایہ دارانہ ممالک کی معاشی حیثیت کے کمزور ہونے اور لاطینی امریکی ملکوں میں مصنوعات کی درآمد میں کمی نے بعض ممالک میں قومی صنعتوں کے زیادہ تیز رفتار ارتقاء کو ممکن بنایا ۔ ارجنٹائن، برازیل، چلی، میکسیکو، یوروگوے، کولمبیا، وینزویلا اور پیرو فوجی اہمیت کے خام مال اور غذائی رسد کو برآمد کرنے والے اہم ممالک تھے جنہوں نے اپنے زرمبادلہ کے ذخائر کافی بڑھا لئے تھے جس سے ان کے صنعتی ارتقاء میں معاونت ملی ۔ ارجنٹائنا، برازیل، میکسیکو اور چلی میں خاص طور سے نئی بھاری صنعت کے مرکز نمودار ہو گئے تھے جنہوں نے خالص زرعی ممالک کو زرعی صنعتی ممالک میں تبدیل کرنا شروع کر دیا ۔ اس صنعتی ارتقاء کے ساتھ ساتھ قومی بورژوازی بھی مضبوط تر ہوئی اور مزدور طبقے کی بھی نشوونما ہوئی ۔

سرمایہ داری سے سوشلزم کی طرف عبور کے دور میں لاطینی امریکہ کے لئے ضروری تھا کہ ایک سوشلسٹ انقلاب کے مسائل طے کرنے کی کوشش کے لئے تعلقہ داریوں کے نظام

اور بیرونی سرمائے کے غلبے کو ختم کرنے کے فریضے کو اولیت دے۔ یہ بات وسطی امریکہ کے کم ترقی یافتہ ملکوں کے لئے بھی سچ ہے اور زیادہ ترقی یافتہ لاطینی امریکی ملکوں کے لئے بھی۔ زمینداروں اور بیرونی سرمائے کے غلبے کو ختم کرنے کی ایک کوشش ۱۹۵۲ء کا بولیویائی انقلاب تھا جو عوام الناس کی وسیع پیمانے پر شرکت سے رونما ہوا لیکن اس کی قیادت قومی بورژوازی نے کی۔ اس انقلاب نے کانوں کے مالکوں اور زمیندار اشراف کی سامراجیت نواز آمریت کو ختم کر دیا اور حکومت کی باگ دوڑ قومی بورژوازی نے سنبھال لی۔ لیکن جیسے جیسے عوام کی سرگرمی میں اضافہ ہوا اور اُس نے بلند تر معیار زندگی کا مطالبہ کیا اور ٹریڈ یونین کی تحریک نے ترقی کی ویسے ویسے بولیویائی بورژوازی کا انقلابی جوش کم ہونے لگا اور وہ بیرونی دباؤ میں آکر رجعت پرستوں کو رعائتیں دینے لگی۔

لاطینی امریکی قوموں کی آزادی کی جدوجہد میں ایک اہم واقعہ گوئٹے مالا کا انقلاب تھا جس نے پورے براعظم پر زبردست اثرات مرتب کئے۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں یوبیکو کی امریکہ نواز آمریت کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور جاگیرداری کی باقیات اور بیرونی سامراجیت پر حملے شروع ہوئے۔ نئی جمہوری حکومت نے پرولتاریہ اور کسانوں کو منظم کرنے میں مدد دی۔ ایک واحد ٹریڈ یونین مرکز اور ایک کسان کنفیڈریشن قائم کئے گئے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے گوئٹے مالا کے خلاف ایک وسیع مہم چلا دی جس نے ۱۹۵۴ء میں براہ راست مسلح مداخلت کی صورت اختیار کر لی اور انقلاب کو کچل دیا گیا۔

ان انقلابات نے قومی بورژوازی کے دوغلے پن کو بھی بے نقاب کر دیا۔ بحیثیت مجموعی قومی بورژوازی جاگیرداری دشمن اور سامراجیت دشمن انقلاب کو فتح مند انجام تک پہنچانے کی اہل ثابت نہیں ہوئی۔ اس طرح ان انقلابات نے ایک بار پھر ایک نئی قسم کے انقلاب عوام کے انقلاب کے مسئلے کو پیش کیا جس میں رہنمایانہ رول مزدور طبقہ ادا کرے، اس لئے کہ کسی اور طرح کا انقلاب جاگیرداری اور سامراجیت سے کارگر طور پر نہیں نمٹ سکتا تھا۔ اس بات کو کیوبا

کے واقعات نے پوری طرح ثابت کر دیا جس کا جائزہ ہم پہلے لے چکے ہیں۔
اس صدی کی ساتویں دہائی کے آغاز میں چلی کا انقلاب عالمی مزدور تحریک کا ایک اہم باب ہے۔ اس لیے اس کی فتوحات اور ناکامیوں کا خاص طور پر جائزہ لیا جانا چاہیئے۔

چلی میں انقلابی عمل کا سبق

چلی میں پاپولر یونٹی حکومت کا قیام اور سرگرمی یقینی طور پر لاطینی امریکی عوام کی جدوجہد آزادی میں کیوبا کے انقلاب کے بعد ایک اہم واقعہ تھا۔ ۱۹۷۰ء میں پاپولر یونٹی کی حکومت خانہ جنگی کے بغیر پُرامن اور آئینی ذریعے سے برسرِ اقتدار آئی، لیکن چلی کی رجعت پرست قوتوں نے امریکی سامراج کے بھرپور تعاون سے انقلاب کو کچل دیا اور عوام پر ایک فاشسٹ فوجی آمریت مسلط کر دی گئی۔ محنت کش عوام کے بہترین سپوتوں کو پُرتشدد طریقوں سے موت کی نیند سلا دیا گیا یا پھر پابند سلاسل کر دیا گیا۔

۵۰ء اور ۶۰ء کے عشروں میں اقتدار پر قابض تمام بورژوا سیاسی قوتیں اپنا دیوالیہ پن ثابت کر چکی تھیں اور ملک کو معاشی اور سیاسی بحران سے نکالنے میں ناکام ثابت ہو چکی تھیں۔ حکمران کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی نے اس بحران سے نکلنے اور معاشرے کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے جو انتظامی اور معاشی اصلاحات نافذ کیں اُنہوں نے اجارہ داریوں اور مالیاتی سرمایے کے مفادات کو متاثر کیا، جس سے حکمران طبقات میں پھوٹ پڑ گئی اور پارٹی کی قیادت بائیں بازو کے پاس چلی گئی۔ حکمران طبقے میں گروہ بندی اور روایتی سیاسی جماعتوں کے انتشار نے ریاستی ڈھانچے بالخصوص ریاستی جبر کے اداروں کو کمزور کر دیا۔ ۱۹۷۰ء تک مزدور طبقہ ٹریڈ یونینوں اور سیاسی پارٹیوں کی سطح پر اتحاد میں کامیاب ہو چکا تھا اور کسانوں اور شہری درمیانے طبقے کا اعتماد حاصل کر چکا تھا۔ ماضی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے چلی کی کمیونسٹ پارٹی نے پرولتاریہ کی قیادت میں اجارہ دار مخالف سامراج دشمن جمہوری اتحاد قائم کرنے کی حکمت عملی اپنائی اور خانہ جنگی کے بغیر صدارتی انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آنے میں کامیاب ہوئی۔ ان انتخابات میں

پاپولر یونٹی بلاک کے امیدوار الینڈے کو ۳۶ رفیصد ووٹوں سے فتح حاصل ہوئی۔

اس طرح پرولتاریہ اپنی سربراہی میں کسانوں، درمیانے شہری طبقے اور غیر اجارہ دار بورژوازی کے بعض حصّوں کو اپنے گرد متحد کرنے اور بہت سی با اثر بورژوا اور پیٹی بورژوا قوتوں کو بے اثر NEUTRALISE کرنے میں کامیاب رہی۔ برسرِ اقتدار آنے پر حکومت نے تانبے، لوہے اور معدنیات کی دوسری صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ آٹوموبائیل، انجنیئرنگ، اسٹیل، ٹیکسٹائل، سیمنٹ، گلاس، کاغذ وغیرہ کے بڑے بڑے کارخانے اور بندرگاہیں بنک اور مواصلاتی ذرائع کو بھی قومیا لیا گیا۔ ان اقدامات کے نتیجے میں صنعتی پیداوار میں ریاستی شعبے کا حصّہ ۱۰ رفیصد سے بڑھ کر ۴۰ رفیصد ہو گیا۔ بیرونی تجارت پر ریاستی کنٹرول نافذ کر دیا گیا اور قومی سطح پر تقسیم کی سروس قائم کی گئی جو اشیاء ضرورت کی ۳۰ رفیصد تجارت کو منظم کرتی تھی۔ مقامی طور پر قیمتوں پر کنٹرول کی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ زراعت میں انقلابی زرعی اصلاحات کو نافذ کیا گیا اور زمینوں کو کسانوں کی کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا (کوآپریٹو کی ایک قسم) یا پیداواری مراکز (ریاستی فارموں کی ایک قسم) کے حوالے کر دیا گیا۔ کسانوں کو دی جانے والی امدادی رقوم میں زبردست اضافہ کر دیا گیا۔

پاپولر یونٹی کی حکومت کے زیرِ تحت ان اقدامات کی وجہ سے بیروزگاری میں کمی واقع ہوئی اور تنخواہوں اور اُجرتوں میں اضافہ ہوا۔ قومی آمدنی میں محنت کشوں کا حصّہ ۵۲ رفیصد سے بڑھ کر ۶۳ رفیصد ہو گیا۔ محنت کشوں کے ٹریڈ یونین مرکز کو سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا اور اس کی ممبرشپ تین گنا ہو گئی۔ زرعی مزدوروں اور کسانوں کی پیشہ ور تنظیمیں بھی مضبوط تر ہوئیں۔ پیداوار کو منظم کرنے اور اشیاء تقسیم کرنے میں محنت کش عوام کی شمولیت یقینی بنائی گئی۔

ان انقلابی اصلاحات کے نتیجے میں سیاسی جدوجہد شدید تر ہونے لگی اور طبقاتی قوتوں میں صف آرائی کا عمل تیز تر ہوتا گیا۔ اس صف آرائی کو اُس وقت مزید تقویت ملی

جب امریکی سامراج جارحیت پر اُتر آیا اور چلی کا معاشی بائیکاٹ کر دیا گیا۔ ملک کی سیاسی زندگی کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش ہوئی اور ذرائع ابلاغ کو کرپٹ کیا گیا اور مسلح افواج میں کھلم کھلا دخل اندازی ہونے لگی۔ سی آئی اے اور غیر ملکی اجارہ داروں نے پیسے کی مدد سے لاک آؤٹ، ہڑتالیں، اور سبوتاژ کے دوسرے اقدامات کو بڑھاوا دیا۔ چلی روایتی طور پر کھانے پینے کی اشیاء درآمد کرتا تھا اور عالمی سرمایہ دارانہ منڈی پر انحصار کرتا تھا۔ اب اُسے تجارتی قرضے فراہم کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی جو معیشت کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔ افراطِ زر میں اضافہ ہوا اور چور بازاری میں وسعت پیدا ہوئی۔ ان حالات میں سوشلسٹ ممالک چلی کی مدد کو آئے اور صرف ۷۲-۱۹۷۱ء میں ۴۶۳ ملین ڈالر کی امداد فراہم کی اور توانائی اور دیگر اہم شعبوں میں بڑے بڑے منصوبوں کی تکمیل میں چلی کی مدد کی۔ الیندے حکومت نے امریکہ اور مغربی یورپ میں پائے جانے والے تضادات کو بھی مہارت سے استعمال کیا۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ انقلابی قوتوں کو سیاسی رہنماؤں اور ریاستی کارندوں کی اُن غلطیوں کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا جو اُن سے ناتجربہ کاری کی وجہ سے سرزد ہوئے۔ ریاستی شعبے میں حکومت کے بہت سے منتظمین نے اپنی من مانی کی اور ان اداروں میں نوکر شاہانہ رویوں کو تقویت بخشی۔

چونکہ یہ تمام تر انقلابی اصلاحات محنت کش طبقات کے مفاد میں کی گئی تھیں اس لئے ایسے امکانات موجود تھے کہ حکومت اُن وسیع سماجی گروہوں اور درمیانے طبقات میں اپنی سماجی بنیاد کو وسعت دے سکتی تھی جو ابھی تک بورژوا یا پیٹی بورژوا نظریات کے زیر اثر تھے اور انہیں انقلاب کا حامی بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن پاپولر یونٹی حکومت کے اندر متضاد رجحانات، اقتدار پر مکمل قبضے کے لئے مربوط حکمت عملی و طریقہ کار کی عدم موجودگی اور ملکی معیشت کی ترقی کے لئے واضح منصوبہ بندی کے فقدان نے حکومت پر عوامی اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ لوئیس کاروالان کہتے ہیں "اب یہ بات بہت واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ انقلاب کے ایک مرحلے سے

دوسرے مرحلے تک عبور، جو ملک کو سوشلزم سے زیادہ قریب لے آتا، کے اس بارے میں کوئی سوچ موجود نہیں تھی۔ ہم نے فوج کے بارے میں بھی اپنی سوچ کو واضح نہیں کیا"۔ پاپولر یونٹی حکومت میں شریک بائیں بازو کے انتہا پسند عناصر کے بعض اشتعال انگیز اقدامات نے درمیانے طبقے کے ڈھلمل عناصر کی کثیر تعداد کو انقلاب کے خلاف لا کھڑا کیا۔

عوامی حکومت کے قیام کے فوراً بعد ہی انقلاب میں شامل پرولتاری اور پٹی بورژوا تصورات کے درمیان شدید قسم کی نظریاتی جدوجہد چھڑ چکی تھی۔ اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے پرولتاری عناصر نے پٹی بورژوازی کے نظریاتی رجحانات کے ساتھ نہ صرف سیاسی سمجھوتہ کیا بلکہ نظریاتی سمجھوتہ بھی کر بیٹھے۔ اندرونی رجعت پرستوں اور سامراجی گماشتوں سے اقتدار مکمل طور پر چھینے اور اُسے جمہوری قوتوں کے ہاتھ میں دیئے بغیر سوشلزم کی تعمیر شروع کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ سوشلزم کو سائنسی مفہوم کی بجائے یوٹوپیائی روپ میں اپنایا گیا۔ بین الاقوامی تجربے کو نظر انداز کرتے ہوئے انقلاب کے حقیقی دشمنوں کی نشاندھی نہیں کی گئی اور عوام کو اُن خلاف منظم نہیں کیا گیا۔ یہ حقیقی دشمن فاشسٹ قوتیں تھیں جنہوں نے بالخصوص مسلح افواج کے ڈھلمل رویّوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور قوم پرستی کو اُجاگر کرتے ہوئے الینڈے کی منتخب حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ پٹی بورژوا رجحانات رکھنے والے عناصر نے نیشنل پارٹی میں بیٹھے ہوئی فاشسٹ قوتوں کے خلاف اپنی طاقت منظم کرنے کی بجائے اپنے حملے کا رُخ بنیادی طور پر کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی کی جانب کیا۔ صرف بیرونی اور اجارہ دار بورژوازی کی ملکیت ہی کو نہیں قومیایا گیا بلکہ درمیانے درجے کی بورژوا ملکیت اور بعض چھوٹے کاروبار کے اداروں کو بھی قومیا لیا گیا، جس سے اس طبقے پر منفی اثرات مرتب ہوئے اور وہ فاشسٹ قوتوں کے ساتھ اتحاد کے لئے مجبور کر دیئے گئے۔ کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی بھی دائیں بازو کی گود میں چلی گئی جہاں ۱۹۷۱ء میں ۸۰ فیصد عوام انقلابی اقدامات کے حق میں تھے تو ۱۹۷۳ء کے پارلیمانی انتخابات میں صرف ۴۳ فیصد رائے دہندگان نے انقلابی پروگرام کی حمایت

میں ووٹ دیا۔ اگست ۱۹۷۳ء میں ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جو رجعتی قوتوں کے اقتدار پر قبضہ کے لئے سازگار تھے، سامراج اور مقامی رجعت پرستوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ستمبر ۱۹۷۳ء میں فاشسٹ ردِ انقلاب برپا کر دیا۔

۰۰۰ اردن کے اس انقلاب کی شکست اُس کے مقدر میں نہیں لکھی تھی۔ اگر انقلابی قوتوں کی حکمت عملی اور طریقہ کار میں مندرجہ بالا عوامل کو پیشِ نظر رکھا جاتا تو اس عظیم انقلاب کا دفاع ممکن تھا۔ چلی اور دنیا بھر کی مزدور تحریک کے لئے یہ تجربہ انتہائی اہم تھا، جو مستقبل میں انقلابی تحریک کو بہت سی ممکنہ غلطیوں سے بچنے کا سبق دیتا ہے۔

لاطینی امریکہ کی تاریخ میں گزشتہ عشرے کا اہم ترین واقعہ نکاراگوا میں سامراج اور اجارہ دار دشمن انقلاب کا برپا ہونا تھا۔ نکاراگوا میں انقلابی عمل کی سربراہی ایک فوجی سیاسی تنظیم کر رہی تھی۔ قومی آزادی کا سانڈینو فرنٹ ۱۹۶۱ء میں وجود میں آیا جسے محب وطن اور جمہوری مزاج رکھنے والے نوجوانوں نے قائم کیا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں فرنٹ نے ایک پروگرام قبول کیا جس میں آمریت کے خلاف جدوجہد کو سامراج مخالف جدوجہد میں بدلنے کا عہد کیا گیا۔ اس پروگرام میں سوشلسٹ تناظر واضح تھا۔ نکاراگوا کے انقلاب کی اہم خصوصیت اس میں عوام کے وسیع تر حصّوں کی سرگرم شمولیت تھی۔ ۲۳ لاکھ کی آبادی والے ملک میں ۴۰ ہزار افراد اس جنگ آزادی میں مارے گئے، ۸۰ ہزار معذور ہو گئے اور ڈیڑھ لاکھ افراد ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

انقلاب کے بعد عوام کے وسیع تر مفاد میں قدرتی وسائل کو قومیا لیا گیا۔ زرعی اصلاحات پر کامیابی سے عمل درآمد شروع ہوا، اجتماعی فارم قائم کیے گئے۔۔ اور جہالت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ صحت عامہ کا موثر نظام قائم کیا گیا اور قومی ثقافت کی ترقی کے لئے اقدامات کئے گئے۔ اس انقلاب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سانڈینو فرنٹ میں تمام شہری درمیانہ طبقہ، بورژوازی اور زمینداروں کے وسیع تر حصّوں نے آمریت کے خلاف جدوجہد میں حصّہ لیا۔

انقلاب کے دوران فرنٹ نے بڑی

مہارت سے مغربی یورپ اور امریکی کارپوریشنوں کے درمیان تضادات کو استعمال کیا اور اُن کے رجعتی کردار کو بڑی حد تک زائل کرنے میں کامیاب رہے۔ فرنٹ نے میکسیکو، وینیزویلا، کوسٹاریکا اور پانامہ کی بورژوا اور پیٹی بورژوا حکمران طبقات کو بھی اس جدوجہد میں اپنی حمایت پر مجبور کردیا۔ غیر جانبدار ممالک اور بین الاقوامی جمہوری تنظیموں نے بھی فرنٹ کی ہر طرح کی اخلاقی اور سیاسی مدد کی۔ ۱۹۸۴ء میں نکاراگوا کی جدید تاریخ میں پہلے حقیقی جمہوری انتخابات منعقد ہوئے جن میں ۸۰ فیصد بالغ آبادی نے حصہ لیا اور انتخاب دہندگان کی دو تہائی تعداد نے فرنٹ کے امیدواروں کو ووٹ دیئے۔ امریکی سامراج انقلاب کی فتوحات کو ضائع کرنے کے لیے ہر ممکن غیر قانونی طریقے سے انقلاب کو سبوتاژ کرنے کی کوشش میں مصروف ہے لیکن بین الاقوامی مزدور تحریک اور سوشلسٹ برادری کی مدد سے نکاراگوا کے محنت کش عوام ان تمام سازشوں کا کامیابی سے سدّباب کر رہے ہیں۔

عالمی مزدور تحریک کا موجودہ مرحلہ

گزشتہ صدی کے وسط میں پرولتاریہ عددی طور پر صرف ۱۰ ملین افراد پر مشتمل تھی جبکہ موجودہ صدی کے آغاز پر اس کی تعداد ۸۰ ملین تک پہنچ چکی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اختتام تک پرولتاریہ ۶۰۰ ملین نفوس پر مشتمل تھا۔ ان میں ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں ۲۳۵ ملین، لاطینی امریکہ میں ۴۰ ملین، ایشیا و افریقہ میں ۱۲۰ ملین اور سوشلسٹ ممالک کے ۱۷۵ ملین محنت کش شامل ہیں۔

مزدور طبقے کی ہراول پارٹیاں جدید دنیا میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں دنیا میں صرف ایک کیمونسٹ پارٹی موجود تھی جس کے اراکین کی تعداد ۰٫۲۴ ملین تھی جبکہ ۱۹۸۲ء میں دنیا کے ۹۵ ممالک میں مزدور طبقے کے نظریات کی داعی پارٹیاں موجود تھیں جن میں ۷۷ ملین سے زائد کیمونسٹ شامل تھے۔ اُن سرمایہ دار ممالک

میں جہاں عام انتخابات منعقد ہوئے ہیں، یہ پارٹیاں ۴۰ ملین ووٹ حاصل کرتی ہیں اور ۲۶ ممالک کی پارلیمنٹوں میں محنت کشوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں مزدور تحریک کا موجودہ مرحلہ

ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک طبقاتی جدوجہد کا اہم میدان ہیں جہاں پرولتاریہ اور اس کے اتحادی سامراجی قوتوں کے عین مقابل کھڑے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان ممالک میں سوشلسٹ انقلاب کے لئے معروضی حالات سازگار اور پختہ ہو چکے ہیں۔ سرمایہ داری کے سماجی ڈھانچے میں ہمہ گیر تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور معاشی طور پر متحرک آبادی میں اُجرتی مزدوروں کی تعداد میں بے مثال اضافہ ہو رہا ہے جن کی تعداد ۱۹۷۹ء میں ۲۶۹ ملین ہو چکی تھی جو برسر روزگار آبادی کا ۸۰ فیصد حصہ بنتا ہے۔ ان اُجرتی کارکنوں میں پرولتاریہ کی تعداد معاشی طور پر متحرک آبادی کا ۷۰ فیصد حصہ ہے۔ (۲۲۰ ملین) اُجرتی مزدوروں کا یہ بے پناہ پھیلاؤ اُن سماجی قوتوں کو مستحکم کرنے کا باعث بن رہا ہے جو اجارہ دار بورژوازی کے استحصال سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف پرولتاریہ زیادہ مختلف النوع ہوتی جا رہی ہے، جس کی وجہ سے بعض مخصوص حالات میں اُنہیں انقلابی جدوجہد میں شریک کرنے میں دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ بیشتر محنت کش جو اجارہ دار بورژوازی کی پالیسیوں سے بری طرح نالاں ہیں اور ان کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیتے ہیں ابھی اس بات کے لئے تیار نہیں ہیں کہ معاشرے کو سوشلسٹ بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

ان ممالک میں سوشلسٹ انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لینن نے کہا تھا کہ مغربی یورپ میں انقلاب کی راہ اتنی آسان نہ ہو گی جتنی کہ روس میں تھی۔ لینن کے مطابق اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مغربی یورپ میں پرولتاریہ کو ایک تجربہ کار اور طاقتور دشمن کا سامنا ہے۔ "وہاں کی بورژوازی ہمارے کرینسکی سے کہیں زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے۔ وہ اس قدر منظم ہو چکی ہے کہ لوگوں کا انقلابی ابھار زیادہ مشکل بنا دے"

اب حالات کافی بدل چکے ہیں اور ترقی یافتہ ممالک میں طبقاتی جبر کے میکینزم کو مزید مؤثر بنانے کے لئے بہت سے اقدامات اٹھائے گئے ہیں تاکہ اسے نئی تاریخی صورتحال کیمطابق بنایا جاسکے اور فرسودہ سرمایہ داری کو برقرار رکھنے کے لئے بورژوازی تشدد، جبر اور سماجی جوڑ توڑ، کسی سے بھی پرہیز نہیں کرتی ۔

لینن یہ بھی کہتا ہے کہ ان ممالک کی پرولتاریہ بورژوا جمہوریت اور پارلیمانی طریقہ کار پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے لگی ہے اور یہاں کا مزدور طبقہ ثقافتی غلامی کا شکار رہے ۔ آج بھی مزدور تحریک میں تقسیم، پرولتاریہ کے ایک بڑے حصے پر طبقاتی تعاون کے اصلاح پسندانہ نظریات کا اثر، بورژوا اصلاح پسند اور کمیونسٹ مخالف نظریات کے وسیع پھیلاؤ وغیرہ کی وجہ سے بورژوازی مزدور طبقے کے بڑے حصے کو اپنی ثقافتی غلامی کا شکار بنائے ہوئے ہے ۔ زیادہ تر سرمایہ دار ممالک میں جو صورتحال دکھائی دیتی ہے اُسے لینن نے اپنے دور میں معاشرے کا انحطاط کہا ہے "نہ تو پسے ہوئے طبقات پر جبر اور نہ ہی حکمران طبقات کا بحران انقلاب برپا کر سکتا ہے" ۔ یہ حالات کسی بھی ملک کو زوال کیجانب ہی لے جاسکتے ہیں جب تک کہ اس معاشرے میں وہ انقلابی طبقہ وجود میں نہ آئے جو جبر کی مفعول حالت سے نکل کر بغاوت اور انقلاب کی عملی شکل اختیار نہ کرے ۔

لیکن ان تمام تر مسائل کے باوجود مزدور طبقہ جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کا سب سے منظم اور کثیر التعداد طبقہ ہے جو مضبوط تنظیمیں رکھتا ہے اور سرمایہ داری کے خلاف لڑنے کی بہترین روایات کا وارث ہے ۔ سائنسی تکنیکی انقلاب کے نتیجے میں برپا ہونے والی معروضی تبدیلیاں ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے محنت کش طبقے میں مسلسل تبدیلیاں لانے کی موجب بن رہی ہیں ۔ اُس کی تعداد، مہارت، ثقافتی سطح اور تنظیم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے ۔ اپنی طبقاتی جدوجہد کے نتیجے میں وہ بورژوازی سے اجرتوں، سماجی قوانین اور بہت سی دوسری مراعات حاصل کر رہا ہے ۔ پیداوار کے میدان میں سائنسی

ترقی سے مزدوروں کی محنت، اُس کی ضروریات اور رہن سہن میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ آخر ان تبدیلیوں نے مزدوروں پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔ کیا اس سے مزدور طبقے کے انقلابی امکانات میں کمی آئی ہے جیسا کہ مارکسزم لیننزم کے بہت سے دائیں اور بائیں بازو کے مخالفین دلیل دیتے ہیں یا یہ تبدیلیاں بورژوا معاشرے کی گہرائیوں میں آتش فشاں لاوے کو جنم دے رہی ہیں اور اسے ایک زیادہ اعلیٰ وارفع سماجی نظام میں ڈھالنے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔

پیداواری طاقتوں کے مزید ارتقار کے نتیجے میں صنعتی مزدوروں میں بہتر تعلیم یافتہ اور ہنر مند محنت کشوں کا ایک حصہ وجود میں آتا ہے جو زیادہ پیچیدہ مشینوں کو چلانا جانتا ہے۔ ان ماہر مزدوروں اور عام محنت کشوں کے درمیان تعلیم، کام کی پیچیدگی اور اُجرتوں کے اعتبار سے بہت فرق ہوتا ہے۔ پیداوار کی مزید ترقی کے ساتھ ساتھ ہنر مند مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور مزدوروں کی زیادہ بڑی تعداد دماغی محنت کو اپنا لیتی ہے۔ پیداوار کے خود کار شعبوں میں یہ عمل زیادہ تیز ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ دماغی محنت کرنے والے تنخواہ دار ملازمین کی بڑی تعداد پرولتاریہ کے قریب آجاتی ہے۔ کیونکہ سرمایہ داری رفتہ رفتہ دماغی محنت کرنے والے کارکنوں کی آزاد حیثیت کا خاتمہ کر دیتی ہے اور اُسے ایک اجرتی کارکن میں بدل دیتی ہے اور اُس کا معیار زندگی پست ہوتا چلا جاتا ہے۔ دماغی محنت کرنے والے کارکنوں کی تعداد کا اندازہ امریکہ سے لگایا جاسکتا ہے جہاں انجنیئر، فنی ماہرین اور دفتری ملازمین صنعتی محنت کشوں کا ۴۰ فیصد حصہ ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتوں میں یہ تناسب مزید بڑھ جاتا ہے اور ۶۰ فیصد کو چھونے لگتا ہے۔

مزدور تحریک کی کامیابیاں اور سائنسی تکنیکی انقلاب کی بدولت محنت کش عوام اپنی روایتی سماجی اور ثقافتی علیحدگی ISOLATION اور بدترین حالات زندگی سے نجات حاصل کر رہے ہیں۔ اُن کی تعلیمی، ثقافتی اور سماجی حیثیت میں بہتری اور محنت

کشوں کی ٹریڈ یونینوں اور سیاسی تنظیموں کا بڑھتا ہوا سماجی وقار انہیں دوسری سماجی پرتوں کے قریب لا رہا ہے۔ پیداوار کے جدید ترین تقاضوں نے جسمانی اور دماغی محنت کرنے والے محنت کشوں کے درمیان سماجی اور نفسیاتی رکاوٹیں دور کرنے میں اہم کردار انجام دیا ہے۔ آج کا مزدور نوجوان تقریباً وہی تعلیم، ثقافتی رہن سہن، طرز زندگی اور ویسے ہی دوست احباب رکھتا ہے جیسا کہ دماغی محنت کرنے والا کارکن۔ ذرائع ابلاغ کی زبردست ترقی اور پھیلاؤ سے محنت کشوں کو بھی وہ ثقافتی، سماجی اور سیاسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو معاشرے کے دوسرے سماجی گروہوں کو میسر ہیں۔ ان تمام تر تبدیلیوں کے باوجود جن کی وجہ سے مزدور اپنی روایتی غربت اور افلاس سے نجات حاصل کر چکے ہیں، اُن کی سماجی حیثیت میں کوئی بنیادی فرق نہیں آیا ہے۔ وہ بدستور سرمائے کے استحصال کا شکار ہے اور سماجی جبر کا سب سے بدتر نشانہ ہے۔

لینن کا کہنا ہے کہ مزدور طبقے کے شعور کو سوشلسٹ اور بورژوا نظریات بیک وقت متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جہاں بورژوا نظریات کا اثر انہیں حکومت یا سرمایہ داروں سے اپنے حالاتِ زندگی بہتر بنانے کے لئے مطالبات منوانے کی حد تک جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے اور انہیں براہ راست اس نظام سے ٹکر نہیں لینے دیتا جنہوں نے اس حیثیت کو جنم دیا ہے، وہاں سوشلسٹ نظریات روزمرہ کی ان لڑائیوں کو ترقی دیتے ہوئے مزدوروں کو اُس شعوری سطح تک لے آتے ہیں جب محنت کی سرمائے سے آزادی اُس کا نصب العین بن جاتی ہے۔ لینن کے مطابق کیمونسٹوں کو پورے مزدور طبقے کی شعوری سطح اور انقلابی امکانات کو مدنظر رکھنا چاہیئے نہ کہ محض اس کے ہراول دستے کو۔

اُنہیں اس بات کا اہل ہونا چاہیئے کہ وہ عوام سے رجوع کرتے وقت صبر اور احتیاط سے کام لیں تاکہ اُس کے ہر حصے کی نفسیات، جذبات اور امنگوں کی امتیازی خصوصیات کو سمجھا جا سکے۔ کسی بھی طبقے کی نفسیاتی بنت اُس کی آئیڈیالوجی سے اس طرح مختلف ہوتی ہے

کہ اس میں سماجی حقیقتوں پر عوام کا خود رو اور جذباتی اظہار زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ جبکہ کسی طبقے کی آئیڈیالوجی اُس کی ضروریات اور مفادات کا نظریاتی اعتبار سے اظہار ہوتی ہے جس میں موجودہ معاشرے کے بارے میں لگے بندھے خیالات اور عملی جدوجہد کا پروگرام شامل ہوتا ہے۔

بورژوا آئیڈیالوجی عوام کے شعور میں ظہور پذیر ہونے والے نئے سماجی نفسیاتی رجحانات سے بے خبر نہیں رہتی بلکہ اس کا ادراک کرتے ہوئے اُن کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہے تاکہ سرمایہ داری نظام کو قائم و دائم رکھا جاسکے۔ یہ مارکسی لینینی سائنس کا فریضہ ہے کہ وہ ان رجحانات کو گہرائی سے جانچیں اور ان کے اظہار کی اشکال پر بورژوا نظریات کے اثرات کا توڑ کریں۔ پرولتاریہ کے طبقاتی شعور کو مسلسل ترقی دینے اور بورژوا نظریات کے بانجھ پن کو بے نقاب کرنے کا یہی ایک واحد راستہ ہے۔ مزدور طبقے کی شعوری سطح کو پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے معروضی حالات زندگی، معیار زندگی، ضروریات میں تبدیلیوں اور پوری سماجی زندگی کو جانا جاسکے۔ یہ عناصر محنت کش عوام کے مختلف حصوں پر تیزی سے اثرانداز ہوتے ہیں اور متضاد سماجی و نفسیاتی رجحانات کو جنم دیتے ہیں۔ اس بات کو مدنظر رکھا جانا چاہیئے کہ مزدور طبقے کو بورژوا یا غیر پرولتاری بننے کے غیر مارکسی نظریات کو یہی رجحانات تقویت پہنچاتے ہیں۔

سرمایہ داروں اور حکومت سے اُجرتوں میں مراعات حاصل کرتے کے دوران محنت کش عوام کے درمیان یہ شعور مزید گہرا ہوتا ہے کہ اُن کے معیار زندگی کا انحصار بڑی حد تک بورژوازی اور مزدور طبقے کے درمیان قوتوں کے توازن سے ہوتا ہے۔ اُسی وجہ سے اُن میں یہ شعور اُجاگر ہوتا ہے کہ اپنے معیار زندگی کو قائم رکھنے اور مزید ترقی دینے کا واحد ذریعہ اُن کا متحدہ طبقاتی عمل ہے۔ جوں جوں محنت کشوں کے ثقافتی معیار میں بہتری آرہی ہے، ویسے ہی اپنی محنت کے سماجی پہلوؤں اور ما فیہم کے بارے میں اُس کے زاویہ

نظر میں تبدیلی آرہی ہے۔ ایسے کام پر شدید احتجاج کیا جارہا ہے جس میں محنت کشوں کی پہل قدمی کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور اُسے غیر انسانی کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

آخر محنت کشوں کی تبدیل ہوتی ہوئی مانگوں اور سماجی تصوارت سے اُن کے طبقاتی شعور اور طبقاتی جدوجہد پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس سوال کی جانب آتے ہوئے یہ بات مدنظر رکھنی چاہئیے کہ مزدور طبقے کے مختلف حصّوں پر ان رجحانات کا اثر یکساں نہیں ہے۔ اجارہ دار سرمائے کی سماجی پالیسیوں اور پراپگنڈہ میں مزدوروں کی مالی و روحانی ضروریات کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کا واضح رجحان پایا جاتا ہے۔ بہت سے جدید کارخانوں میں انتظامیہ کی جانب سے مزدوروں کا احترام کیا جاتا ہے۔ پیداوار میں اُن کی دلچسپی بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان تمام تر اقدامات کے ذریعے "جمہوری پارٹنرشپ" کی فضا پیدا کی جاتی ہے۔

نت نئی صنعتوں کی ترقی کے لئے ہنر مند کارکنوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے صنعتکار اس بات پر مجبور ہیں کہ وہ انہیں فنی تربیت دلائیں۔ اس تربیت کا بہت پراپگنڈہ کیا جاتا ہے اور کارکنوں کے لیے نئے مواقع اور امکانات پیدا ہونے کا ڈھنڈورہ پیٹا جاتا ہے۔ ایسی صنعتوں میں کارکنوں کی نسبتًا بہتر اُجرتیں اور معیار زندگی ایسے پروپیگنڈہ میں معاون ثابت ہوتے ہیں کہ ان صنعتوں کے مالکان اور محنت کشوں کے مفادات ایک ہیں۔ دوسری طرف محنت کشوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات اُن میں طبقاتی شعور پیدا کرتی ہیں۔ جیسا کہ فرانس اور اٹلی کی مثال سے ظاہر ہے جہاں کمیونسٹ پارٹیاں بے حد وسیع اور طاقتور اثرو نفوذ رکھتی ہیں اور ایسے صنعتی اداروں میں اُن کا اثرو رسوخ بڑھ رہا ہے جہاں محنت کشوں کا تعلیمی اور ثقافتی معیار نسبتًا زیادہ بہتر ہے۔ زیادہ تعلیم یافتہ اور ہنر مند کارکن پارٹی اور ٹریڈ یونینوں میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ بہتر معیار زندگی اور زیادہ قابلیت کی بدولت یہ محنت کش بہت سی ایسی مالی ترغیبوں اور مشکلات کا شکار نہیں ہوتے جو دوسرے محنت کشوں

میں عام ہیں۔

محنت کشوں کی ضروریات، معیار زندگی اور طبقاتی شعور کا تعین بڑی حد تک پرولتاریہ کے سماجی حالات سے ہوتا ہے۔ ایک محنت کش طبقاتی جدوجہد میں شرکت پر اس لئے بھی مجبور ہوتا ہے کہ اسے اپنے مستقبل کے لئے کوئی بہتر امکانات دکھائی نہیں دیتے۔ اُسے اپنے کام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی اور اپنے پیشے میں ترقی کے مواقع محدود ہوتے ہیں، اس لئے پارٹی یا ٹریڈ یونین میں اُس کی سماجی سرگرمی ہی اُس کی زندگی کو نئے معنی بخشتی ہے اور اُسے با مقصد بناتی ہے۔ یہ سرگرمی اُسے اپنی تحریک کے مقاصد سے بھی روشناس کرواتی ہے جو معاشی مانگوں تک ہی محدود نہیں رہتا۔ گزشتہ سالوں سے محنت کش عوام زیادہ سرگرمی سے اندرونی اور خارجہ پالیسی کے مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کرنے لگے ہیں اور حکمران طبقات کی پالیسیوں کے خلاف بے مثال جدوجہد کر رہے ہیں۔

اُن ممالک میں جہاں وسیع ترین مارکسی لیننی تنظیمیں موجود ہیں وہاں یہ محنت کش انقلابی اور سوشلسٹ نظریات کے اسیر ہوتے ہوئے جدوجہد میں شریک رہتے ہیں جبکہ وہ ممالک جہاں مزدور تحریک میں اصلاح پسند اور خالص "معاشی" نقطہ نظر کا دور دورہ ہے، یہ انقلابی رجحانات "حقیقی زندگی" کے لئے مبہم خواہش کا روپ دھار لیتے ہیں یا خود رو احتجاج میں ڈھل جاتے ہیں جن میں ناکامی کی صورت میں اکثر اوقات وہ اجتماعی جدوجہد سے بے دلی اور غیر یقینی کی کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بہت سے بورژوا ماہرین عمرانیات کے نزدیک یہ عمل پرولتاری شعور میں ناقابل پلٹ انحطاط و انتشار کا مظہر ہے۔ جبکہ حقیقت میں یہ اس چیز کا اظہار ہے کہ اصلاح پسند آئیڈیالوجی محنت کش طبقے کے اہم ترین مسائل کا حل پیش کرنے سے قاصر ہے اور مارکسی ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ اس تحریک کو ایک واضح سمت دے سکیں۔

کمیونسٹ جن سماجی تبدیلیوں کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اُن میں جمہوری منصوبہ

بندی، کلیدی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینا، پیداوار پر محنت کشوں کا کنٹرول، تعلیم اور ثقافت کے میدان میں محنت کشوں پر عائد سماجی پابندیوں کا خاتمہ اور جمہوری حقوق کا وسیع تر کرنا شامل ہیں۔ یہ اقدامات سماجی زندگی کے ہر میدان میں محنت کش عوام کی فعال شمولیت کو یقینی بنانے میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور محنت کش عوام کی مسلسل انتھک جدوجہد میں رہنما کردار ادا کرتے ہیں۔

درمیانے درجے کے ترقی یافتہ ممالک میں مزدور تحریک

ان ممالک میں ترکی، یونان، پرتگال، آئرلینڈ، قبرص، میکسیکو، وینزویلا اور مالٹا وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے۔ ان ممالک کی اہم خصوصیت سرمایہ دارانہ استحصالی نظام پیداوار کے ساتھ ساتھ ماقبل سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں کی موجودگی اور بیرونی سرمائے پر انحصار شامل ہے۔ ان ممالک میں سرمایہ داری کی غیر ترقی یافتہ شکل اور حکمران طبقات کی کمزوری یہاں انقلاب کے امکانات کو زیادہ روشن بنا دیتی ہے۔

ان ممالک میں بہت سے ایسے عمومی جمہوری اور بورژوا جمہوری مقاصد حل ہونے باقی ہیں جنہیں سرمایہ داری حل نہیں کر سکی ہے۔ ان سامراج مخالف جمہوری مقاصد کو حل کرنے کے لئے عوام کی ایک بڑی تعداد کو متحرک کرنا ممکن ہے۔ آج کل ان ممالک کی صنعت اور زراعت میں سرمایہ داری بحیثیت ایک طریقہ پیداوار کے غالب رجحان رکھتی ہے۔ ان ممالک کی مجموعی قومی آمدنی میں سرمایہ دارانہ اور ماقبل سرمایہ دارانہ ڈھانچوں کا تناسب تین اور ایک کا ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک میں یہ تناسب ایک اور تین کا ہے۔ مقامی بورژوازی بطور ایک طبقہ یہاں بہت پہلے ترقی کر چکی ہے اور انتظامی امور میں کافی تجربہ کار ہے۔ بورژوازی اب بھی سامراج سے لڑنے کی اہلیت رکھتی ہے، لیکن اس نے عرصہ ہوا خود کو عوامی جمہوری دھارے

سے علیحدہ کرلیا ہے اور پرولتاریہ کی جانب اس کا مخاصمانہ رویہ اس کے رجعتی کردار کو مزید مضبوط بناتا ہے۔

ان ممالک میں مزدور طبقہ کارخانوں اور زرعی پرولتاریہ کے بڑے گروہوں ٹرانسپورٹ، تجارت، فنانس اور خدمات کے شعبوں سے متعلق ملازمین پر مشتمل ہے۔ ان ممالک میں بورژوازی یا تو سیاسی اقتدار پر مکمل طور پر قابض ہے یا اسے بڑے زمینداروں کے ساتھ اشتراک کے ذریعہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جنوبی اور جنوب ایشیائی یورپ کے بعض ممالک اور آئرلینڈ وغیرہ کو ریاستی درجہ دوسرے ممالک سے دیر میں حاصل ہوا۔ ان ممالک میں سرمایہ داری کی سست رفتار ترقی کی وجہ سے یہاں بڑے زمینداروں علما اور فوجی وسول بیوروکریسی کی بالائی پرتوں کو بہت سی مراعات حاصل رہیں۔ ان کی یہی کمزوری انہیں مالیاتی سرمائے کے پھیلاؤ کا شکار بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔ درحقیقت یہ ملک خود انحصاری کی منزل تک نہیں پہنچ پائے۔ محدود اندرونی منڈی کی وجہ سے آبادی کے بڑے حصوں کو روزگار کے لئے بیرون ملک ہجرت کرنا پڑی جس کی وجہ سے ان کی معاشی پسماندگی مزید گہری ہوتی گئی۔

ان ممالک کی انقلابی قوتیں یہاں پر دو مرحلوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ سامراج مخالف اجارہ دار مخالف جمہوری مرحلہ اور سوشلسٹ مرحلہ۔

لاطینی امریکہ کے ممالک کی غالب اکثریت انیسویں صدی کے آغاز میں اپنی گردن سے غلامی کا جوا اُتار پھینک چکی تھی۔ اور سرمایہ دارانہ ترقی کی راہ پر گامزن تھی۔ یہاں پر اُجرتی مزدور معاشی طور پر متحرک آبادی کا ۵۰۔۶۰ فیصد حصہ ہیں مزدوروں کا ۱۰ فیصد حصہ پیداواری صنعت سے منسلک ہے جن میں سے ۲۵ فیصد سے زائد مزدور بڑے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ لیکن پرولتاریہ کا متحد نہ ہونا اُن کی لڑاکا صلاحیت کو کم کردیتا ہے۔ مزدوروں کا ایک وسیع حصہ قوم پرست،

نام نہاد پاپولسٹ پارٹیوں کا ساتھ دیتے ہیں جو اصلاح پسند نظریات رکھتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک درمیانی سطح کے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک ہیں جن میں ایک طرف تو ماقبل سرمایہ دارانہ رشتوں کی باقیات ہیں تو دوسری طرف سامراج پر انحصار قائم ہے۔ بورژوازی اپنی انقلابی صلاحیتوں کو کھو چکی ہے اور سامراج سے ہر قسم کے شرمناک سمجھوتے کے لئے تیار ہے۔ سامراج اور مقامی مالیاتی سرمائے کے خلاف جدوجہد میں مزدور طبقہ سب سے متحرک طاقت ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کا صنعتی مرکز ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی طرح مضبوط نہیں ہے لیکن یہ طبقہ اپنی کئی نسلیں انقلابی تجربے کی بھٹی سے نکال چکا ہے۔ کان کن اور باغات میں کام کرنے والے مزدور اپنی لڑاکا صلاحیتوں کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ کثیر القومی کارپوریشنوں کی ملکیت والے اداروں میں تقریباً ۲۰ لاکھ مزدور برسرروزگار ہیں۔ ریاستی شعبے کے محنت کشوں کے ساتھ یہ مزدور پرولتاریہ کا سب سے فعال اور لڑاکا جتھہ ہیں۔

لاطینی امریکہ کا مزدور طبقہ سرمایہ دار دنیا میں پرولتاریہ کی مجموعی تعداد کا ۱۰ فیصد حصہ ہے لیکن دنیا بھر میں ہونے والی ہڑتالوں میں سے ایک تہائی انہی ممالک میں ہوتی ہیں۔ سامراج اور مقامی رجعت پرستوں کے خلاف جدوجہد میں مزدور طبقہ تمام اجارہ دار دشمن قوتوں کو اپنے گرد جمع کرتا ہے جن میں کسان، شہری درمیانہ طبقہ اور بورژوازی کے غیر اجارہ دار حصے شامل ہیں۔

ترقی پذیر ممالک میں مزدور تحریک

پچھلی تین دہائیوں سے عالمی انقلابی عمل میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی سامراج دشمن تحریک کا کردار برابر بڑھ رہا ہے۔ یہ ممالک ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک سے اپنے تعلقات کی نوعیت میں بعض بنیادی تبدیلیاں لانے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور ایک نئے منصفانہ عالمی اقتصادی نظام کے لئے اپنی جدوجہد تیز کر رہے ہیں۔

سامراج پر ہند چینی عوام کی فتح اور سوشلسٹ ترقی، افریقہ میں ماسوائے جنوب کے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ اور انگولا، موزمبیق، ایتھوپیا، بینن، یمن، مڈغاسکر میں ترقی پسند عوامی حکومتوں کا قیام، افغانستان میں جمہوری انقلاب اور ایران میں شہنشاہیت کا خاتمہ عالمی سطح پر سامراج کی طاقت کو محدود کرنے میں کلیدی عناصر ہیں۔

گزشتہ عشروں میں نوآزاد ممالک نے صنعت اور زراعت کے میدان میں خاصی ترقی کی ہے۔ لیکن تمام تر کامیابیوں کے باوجود عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ترقی پذیر ممالک کی پوزیشن میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ ۱۹۷۵ء میں سرمایہ دار ممالک کی کل صنعتی پیداوار میں اُن کا حصہ صرف ۱۴-۱۲ فیصد تھا۔ ان ممالک میں ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں فی کس قومی آمدنی ۱۱ گنا کم ہے۔ اس عشرے کے شروع میں ان ممالک پر بیرونی قرض ۴۰۰ بلین ڈالر سے تجاوز کر رہے تھے۔ ان قرضوں پر ترقی پذیر ممالک ۲۷ بلین ڈالر سالانہ سود ادا کر رہے ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ ان ممالک میں صنعت کاری کا عمل نہایت سست رفتار ہے، محنت کش آبادی میں اُجرتی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ صرف ایشیا میں ۷۹-۱۹۷۰ء کے درمیان اُجرتی مزدوروں کی تعداد میں ۶۰ ملین کا اضافہ ہوا جبکہ افریقہ میں یہ اضافہ ۱۱ ملین رہا۔ لیکن ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے مقابلے میں جہاں مصروف کار آبادی کا ۸۰ فیصد حصہ صنعتی مزدوروں اور دفتری ملازمین پر مشتمل ہے وہیں سابقہ نوآبادیوں یا نیم نوآبادیوں میں ان کی تعداد صرف ۳۰ فیصد ہے۔ ان ممالک میں پرولتاریہ کے ڈھانچے میں بعض کیفیتی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور بڑے کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان ممالک میں ابھی تک دفتری ملازمین کو مزدوروں کے مقابلے میں بہت سی مراعات حاصل ہیں اور حکمران طبقات شعوری طور پر اس فرق کو برقرار رکھنے اور دونوں حلیفوں کو قریب آنے سے روکنے

کے لئے ان مراعات کو استعمال کرتے ہیں۔

ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں زرعی مزدوروں اور کسانوں کی تعداد تقریباً سو ملین ہے جو تمام اُجرتی مزدوروں کا ۵۴ فیصد حصّہ ہیں۔ زراعت سے وابستہ زیادہ تر محنت کش ابھی تک چھوٹے قطعوں کے مالک ہیں جس کی وجہ سے اُن میں ابھی تک مالکانہ ذہنیت باقی ہے۔ اکثر اوقات زرعی مزدوروں اور کسانوں کا استحصال سرمایہ دارانہ طریقوں ہی سے نہیں بلکہ نیم جاگیردارانہ طرز سے بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت پرولتاری اور چھوٹے مالک کی متضاد خصوصیات رکھتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ صنعتی مزدوروں کی طرح بہتر اُجرتوں، اوقات کار میں کمی، مزدور قوانین کے فوائد اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو دوسری طرف زرعی اصلاحات، تجارتی غلامی اور قرضوں کے خلاف کسانوں کے ساتھ مل کر آواز بلند کرتے ہیں۔ زرعی مزدوروں کا یہ دوہرا کردار اور اُن کا بڑے علاقے میں بکھرا ہوا اُنہیں منظم کرنے میں کافی مشکلات کا باعث بنتا ہے اور سامراج کے خلاف اور سماجی ترقی کے لئے صنعتی و زرعی مزدوروں کی مشترکہ جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

سابقہ نوآبادیوں میں ترقی کے عمل کے ساتھ ساتھ ایسے رجحانات زیادہ واضح ہوتے جا رہے ہیں جو جدید پرولتاریہ کو پنپنے، مستحکم ہونے اور طبقاتی شعور بلند کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ لیکن مزدور طبقے کے بے پناہ امکانات کو اسی وقت بروئے کار لایا جا سکتا ہے اگر اُن مشکلات کو سامنے رکھا جائے جو اس حقیقت سے اُبھرتی ہیں کہ جدید پرولتاریہ کی نشوونما ابھی ادھوری ہے اور اس کے بہت سے انفرادی حصّے ابھی سماجی اور معاشی بلوغت تک نہیں پہنچے۔ مختلف نسلی گروہوں اور قومیتوں سے تعلق رکھنے والے مزدور ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور صرف اپنے قبیلے یا قومیت کے گروہوں سے میل جول رکھتے ہیں اور ابھی تک اپنی قبائلی تنظیموں کے زیر اثر ہیں۔

اُن ممالک میں جہاں سرمایہ داری اپنے قدم نسبتاً جما چکی ہے وہاں ماہر مزدوروں کی ایسی پرت بھی وجود میں آرہی ہے جو کل مزدوروں کے ۱۵ - ۵ فیصد حصّے پر مشتمل ہے۔ ان ماہر مزدوروں کی اُجرتیں عام محنت کشوں کے مقابلے میں دو سے چار گنا زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں بہت سے دوسرے سماجی تحفظات بھی حاصل ہیں۔ اُن کی ملازمتیں نسبتاً زیادہ مستحکم ہوتی ہیں۔ اس طرح ان ماہر مزدوروں کی بالائی پرت میں ایسے امکانات پیدا ہو رہے ہیں کہ وہ عام پرولتاریہ سے کٹ جائیں اور ایک طرح کی مزدور اشرافیہ میں تبدیل ہو جائیں جو ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں پہلے سے موجود ہے۔

بہت سی پابندیوں کے باوجود اس صدی کی ساتویں دہائی کے وسط تک بہت سے ترقی پذیر ممالک میں مضبوط ٹریڈ یونین مراکز قائم ہو چکے تھے۔ لاطینی امریکہ میں ۱۴ ملین، ایشیا میں ۱۲ ملین اور افریقہ میں ۵ ملین مزدور ٹریڈ یونینوں کے ممبر تھے۔

لینن نے اپنے دور میں یہ سمجھتے ہوئے کہ ترقی پذیر ممالک میں یہ ضروری نہیں کہ مارکسی لیننی پارٹی ہی تحریک آزادی کی آگوائی کرے، اُن دوسری قوتوں کی بھی نشان دہی کی جو اس تحریک کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ ایسی صورت میں مارکسیوں کا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایک متحدہ سامراج دشمن جمہوری فرنٹ کے قیام کے لئے جدوجہد کریں، ایسی قوتوں کے ساتھ اتحاد کریں جو اس تحریک میں معاون ہو سکتی ہیں اور اُنہیں ترقی پسند سماجی اصلاحات کرنے کے لئے مجبور کریں۔ چونکہ مزدور طبقے کے مفادات دوسری جمہوری اور محب وطن قوتوں سے یگانگت رکھتے ہیں اس لئے مزدوروں اور کسانوں، چھوٹی اور درمیانی بورژوازی اور دوسرے درمیانے طبقات کے درمیان وسیع تر طبقاتی اتحاد بننے کے معروضی امکانات موجود ہیں۔

افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ممالک میں سماجی ترقی کا رخ سوشلزم کی جانب ہے۔ ان ممالک کی پرولتاریہ قومی جمہوری تبدیلیوں اور متحدہ سامراج دشمن قومی جمہوری محاذوں

کے قیام میں سب سے مستقل مزاج اور انقلابی طبقے کی حیثیت سے حصہ لیتا ہے۔ سامراج مخالف لڑائیوں میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ پرولتاریہ مقامی بورژوازی کے رجعت پرست رجحانات کے خلاف بھی لڑتا ہے اور اسے اپنی طبقاتی خود غرضی کو محدود کرنے اور کسی حد تک قوم کی محنت کش اکثریت کے مفادات کو بھی مدنظر رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس جدوجہد کے دوران پرولتاریہ کی تنظیم کا معیار بلند ہو رہا ہے، اُس کی صفیں مزید متحد ہو رہی ہیں اور اس کے طبقاتی شعور میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان ممالک میں طبقاتی جدوجہد کا تجربہ شاہد ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کے غلبے، رشوت ستانی، اختیارات کے ناجائز استعمال کے خلاف جدوجہد میں ٹریڈ یونین تحریک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مگر ان ممالک بشمول ایشیاء اور افریقہ کے بیشتر ممالک میں ٹریڈ یونین تحریک انتشار کی شکار ہے اور ایک متحدہ مرکز کا فقدان ہے۔

لیکن بین الاقوامی مزدور تحریک کی کامیابیوں اور عالمی سوشلسٹ نظام کی قوت میں اضافے نے کسی بھی ملک میں مزدور طبقے کے وقار کو بحال کرنے کی بنیادیں فراہم کر دی ہیں چاہے اُس کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہوں۔ بہت سے نو آزاد ممالک میں آہستہ آہستہ مزدور طبقے کے قومی جمہوری انقلاب کی راہنما قوت بننے کے معروضی حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کا راستہ مزدور طبقے کے سیاسی اور ٹریڈ یونین اتحاد کو مضبوط کرنے اور محنت کش عوام کے اندر اُس کے اثرات پھیلانے میں ہے۔

عالمی مزدور تحریک میں دائیں اور بائیں بازو کے نظریاتی رجحانات

مارکسی لینن نظریات کو ماننے والوں اور سائنسی سوشلزم کی تھیوری اور عمل کو رد کرنے والوں کے درمیان نظریاتی جدوجہد کا سب سے اہم سوال تاریخی ترقی میں مزدور طبقے کا کردار ہے۔

اصلاح پسند "جدید سرمایہ داری" اور "صارفین کے معاشرے" کے حوالے سے یہ دعویٰ کرتے نہیں جھجکتے کہ ان معاشروں میں طبقاتی تضادات ماند پڑ چکے ہیں۔

اور طبقاتی جدوجہد کے جاری رہنے کے لئے معروضی حالات نا پید ہیں۔ دوسری طرف سائنسی سوشلزم کے بائیں بازو کے تنقید نگار یہ دوہراتے نہیں تھکتے کہ جدید دور میں کسان یا دانشوروں کے چند مخصوص گروہ سماجی ترقی میں رہنما قوت کا کردار ادا کریں گے۔

سوشل ڈیموکریسی

سامراجی ممالک کے حکمران طبقات سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں اور تنظیموں کی سیاست اور نظریات کے قدامت پسند پہلوؤں کی مدد سے اپنے ممالک میں انقلابی عمل کی ترقی میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ "جمہوری سوشلزم" درحقیقت ایسے غیر سائنسی سماجی و معاشی، سیاسی اور فلسفیانہ تصورات کا ملغوبہ ہے جسے وقت کی فوری ضروریات اور عوامی ذوق کے مطابق بدلا جا سکے۔ یاد رہے کہ سوشلسٹ انٹرنیشنل کی زیادہ تر پارٹیاں مارکسزم کو رد کرتے ہوئے "جمہوری سوشلزم" کے تصور تک پہنچی ہیں۔ اُن کے مطابق مارکسزم فرسودہ اور تقلید پرست ہو چکا ہے جو جدید معاشرے سے مطابقت نہیں رکھتا۔

سوشل ڈیموکریسی کے نامور مفکر برنشٹائن کے مطابق سرمائے کے ارتکاز، درمیانہ پرتوں کی پرولتاریہ کی صفوں میں شمولیت اور سماجی انقلاب کے مارکسی نظریات غلط ثابت ہوئے ہیں اور سرمایہ داری کے بطن سے نئے سماج کے عناصر جنم لے رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی تمام تر توجہ اس جانب مرکوز کرنی چاہیئے تاکہ ریاست میں جمہوری تعلقات رائج کر سکیں۔ ہیلفرڈنگ کہتا ہے "سرمایہ داری اپنے جوہر میں تبدیل ہو چکی ہے اور آزاد مقابلے کے قانون کی جگہ اب منظم سرمایہ داری وجود میں آ رہی ہے جس میں سوشلسٹ منصوبہ بندی کا اصول منڈی کے اندھے خودرو قوانین کی جگہ لے رہا ہے۔ یہ "سوشلسٹ" مفکرین سمجھتے تھے کہ کارخانوں میں مزدوروں اور اُن کی ٹریڈ یونینوں کو رفتہ رفتہ پیداوار کے عمل میں شریک کر کے ایسی معاشی جمہوریت قائم کی جا سکتی ہے جس کے ذریعے ریڈیکل اقدامات سے سرمایہ دارانہ ملکیت کا خاتمہ کئے بغیر پیداوار کا عمل اور

سیاسی اقتدار آہستہ آہستہ مزدوروں کے ہاتھ میں آجائیگا۔

سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کے پروگراموں میں مارکسی نظریات یا اصلاحات دور دور تک دکھائی نہیں دیتیں۔ اُن کی موجودہ دستاویزات بورژوا نظریات عیسائی منقولات اور قدیم اصلاحی تصورات کا ملغوبہ دکھائی دیتی ہے۔ ایک فرانسیسی اصلاح پسند نظریہ دان کے مطابق "یہ تصور کہ سماجی تبدیلی کسی حادثے یا انقلاب کے ذریعے عمل میں آتی ہے، جس کی بنیاد سماجی تعلقات میں تضادات کا بڑھنا ہے، قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ سماجی تبدیلی بتدریج "آسان جستوں" میں واقع ہوتی ہے۔ سوشل ڈیموکریٹک نظریہ دانوں کا کہنا ہے کہ پرانی سرمایہ داری اپنے سب سے کم یہ تضادات پر قابو پا چکی ہے اور اب مزدور طبقہ وہی شوق رکھتا ہے جو دوسرے طبقات کے پاس ہیں اور سوشلزم اپنے معنی کھو چکا ہے۔ جرمن سوشل ڈیموکریٹوں کے مطابق ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت تحفظ طلب کرنے کی حقدار ہے جب تک وہ ایک منصفانہ سماجی نظام کے قیام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اُن کے مطابق سرمایہ دارانہ ممالک میں پیش آنے والے واقعات نے ریاست، طبقات اور انقلاب کے بارے میں روایتی تصورات کو بدل دیا ہے۔ پیٹر وینبی کہتا ہے کہ "اب ریاست کسی ایک طبقے اور وہ بھی معاشی طور پر طاقتور طبقے کی اجارہ داری اور ڈکٹیٹر شپ کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ کئی طبقات کے درمیان سماجی EQUILIBRIUM ہے۔"

اُن کے مطابق اب انقلاب کا تصور تشدد، خانہ جنگی یا کسی طبقے کی ڈکٹیٹر شپ کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ معاشرے کے جمہوری ارتقاء کا تصور ہے جو بتدریج سماجی زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کی جانب بڑھ رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پرولتاریہ اقتدار پر قبضہ کر کے بورژوازی کو وہی جمہوری آزادیاں فراہم کرتا ہے یا نہیں جو محدود پیمانے پر وہ بورژوازی سے حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ یہاں پر ہمیں انقلاب کے نتیجے میں فتح یاب ہونیوالی پرولتاریہ کا مقابلہ اُس بورژوازی سے کرنا ہے جس نے جاگیرداری کو شکست دی تھی۔ بورژوا

انقلاب برپا کرتے ہوئے بورژوازی نے جاگیرداری کے خلاف تمام پسے ہوئے طبقات کی انتہائی کی تھی اور اس انقلاب میں جاگیرداروں پر کاری ضرب لگاتے ہوئے انہیں سیاسی اور سماجی اقتدار سے محروم کر دیا تھا۔ یہی فریضہ آج پرولتاریہ کو انجام دینا ہے اور تمام استحصال زدہ عوام کو اپنی قیادت میں متحد کرتے ہوئے سرمایہ داری کو موت کا پروانہ ہاتھ میں تھمانا ہے۔ اس لئے بورژوازی کو جمہوری حقوق دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں استحصال کرنے والے اور استحصال زدہ کو ایک دوسرے سے آزادی میسّر ہو؟

جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے، مزدور طبقے میں تفریق ختم کرنے کے لئے مزدور تحریک میں غالب رجحانات کے حامل کمیونسٹوں اور سوشل ڈیموکریٹوں کے درمیان اتحاد اور اصلاح پسند پالیسیوں پر اصولی تنقید کو ایک جدلیاتی رشتے میں جوڑنے کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھا جانا چاہیئے کہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں میں دائیں بازو کے رہنماؤں اور نظریہ دانوں کے ساتھ ساتھ لیسے لاکھوں محنت کش بھی موجود ہیں جن میں سے بیشتر اپنے رہنماؤں کے وعدوں پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ سرمایہ داری میں اصلاح کے ذریعے سماجی، معاشی اور سیاسی میدانوں میں بہت سی تبدیلیاں لاسکتے ہیں اور حقیقی سماجی ترقی کے لئے جدوجہد کی صحیح راہ تلاش نہیں کر پاتے۔ یہ محنت کش بالکل بے خبر ہو کر اپنے رہنماؤں کی تقلید نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سوشل ڈیموکریٹ ان محنت کشوں پر اس وقت تک اپنا اثر برقرار نہیں رکھ سکتے جب تک کہ وہ واقعی ان کے بعض مطالبات پورے نہ کروا دیں۔

جیسے جیسے سرمایہ داری کا عمومی بحران زور پکڑ رہا ہے ویسے ہی سوشل ڈیموکریٹک تحریک میں بھی اہم تبدیلیاں آرہی ہیں اور اس کے عام کارکنوں اور دائیں بازو کے رہنماؤں کے درمیان تفریق نمایاں ہو رہی ہے۔ مارکسی اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ سوشل ڈیموکریسی مغرب کی مزدور تحریک میں مضبوط جڑیں رکھتی ہے اور ایک بااثر رجحان ہے اور اس

رجحان کو کلی طور پر بورژوازی کا ایجنٹ قرار دینا نا انصافی ہوگی۔ بعض ادوار میں یہ پارٹیاں مزدور طبقے کے وسیع تر حصوں کے مطالبات آگے بڑھانے میں پیش پیش رہی ہیں اور بہت سے مثبت نتائج حاصل کر چکی ہیں جو محنت کشوں کی روزمرّہ جدوجہد میں، بے انتہا اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً سویڈن میں کمیونسٹوں کی مدد سے وہاں کے سوشل ڈیموکریٹ عوامی پنشن کا قانون منظور کروانے میں کامیاب رہے ہیں۔ اسی طرح برطانیہ میں لیبر پارٹی بچوں کے لئے مفت تعلیم، صحت عامہ کی سہولیات اور بعض دیگر مراعات حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے جس کی وجہ سے اسے ٹریڈ یونین تحریک کی سرگرم حمایت حاصل رہی ہے۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کی ممبر شپ ۲۰ ملین ہے جبکہ عام انتخابات میں ۷۵ ملین لوگ ان پارٹیوں کے امیدواروں کو ووٹ ڈالتے ہیں۔

لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ سرمایہ دار ممالک میں سوشل ڈیموکریٹ جو سیاسی اثر رکھتے ہیں اُسے مزدور تحریک کو سوشلسٹ بنیادوں پر ترقی دینے کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کا دایاں مفاد پرست عنصر جس طریقے سے سرمایہ دارانہ نظام سے جڑا ہوا ہے وہ اجارہ دار بورژوازی کی پالیسی کے اُس رُخ کی جانب واضح اشارہ کرتا ہے جو پرولتاری تنظیموں کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہیں، انہیں اُن کی آزادی سے محروم کرنا چاہتی ہیں اور اُن میں پھوٹ ڈالنے کی خواہشمند ہیں۔

اُن تمام ممالک میں جہاں سوشل ڈیموکریٹ بہت سالوں سے اقتدار پر قابض ہیں، وہ وہاں کے بنیادی نظام میں تبدیلیاں لانے میں ناکام رہے ہیں۔ فرانسیسی سوشلسٹ پارٹی کے رہنما موہے کا کہنا ہے "اس سلسلے میں سکینڈے نیویا کی مثال سامنے ہے۔ میرے خیال میں یہاں پر ہم اصلاحات کے ذریعے سرمایہ دار ریاست سے وہ سب کچھ حاصل کر چکے ہیں جو اس کی حدود میں رہتے ہوئے ممکن تھا۔ اب ہم اُس مقام پر پہنچ رہے ہیں جہاں پر ہمیں جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود سرمایہ دارانہ نظام پر ضرب

لگانے کے متعلق سوچنا چاہئیے۔"

سرمایہ دار ممالک میں مزدور تحریک کا تجربہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سوشل ڈیموکریٹوں کی صفوں میں تفریق نمایاں ہے۔ سوشل ڈیموکریسی کے دائیں بازو کو صرف کمیونسٹوں کی جانب ہی سے نہیں بلکہ اپنی ہی تنظیموں کے اُن کارکنوں کی جانب سے بھی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو سوشلزم کو اپنی حقیقی منزل تصوّر کرتے ہیں۔ وہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں جو بورژوا تنظیموں سے اتحاد کی راہ پر گامزن ہے، کے کارکنوں میں بے اطمینانی اور عدم اعتماد کا اظہار بڑھتا جا رہا ہے اور بائیں بازو کے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جن میں سے کچھ علیحدہ پارٹیوں کا روپ دھار رہے ہیں جو کمیونسٹوں سے اتحاد کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ بورژوا پارٹیوں سے قریبی اتحاد اور تعاون سوشل ڈیموکریسی کو کمزور اور منتشر کر رہا ہے۔

ٹراٹسکی ازم نیو لیفٹ، مارکیوزے اور یورو کمیونزم

پیچیدہ اور گہرے انقلابی عوامل بہت تیزی سے جدید دنیا کا چہرہ تبدیل کر رہے ہیں اور اجارہ دار بورژوازی کے خلاف جدوجہد میں مختلف سماجی قوتوں کی شمولیت وسیع تر ہو رہی ہے۔ سرمایہ دار ممالک کی آبادی کے سماجی ڈھانچے میں دوررس تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اُجرتی مزدوروں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ ایسی بے شمار درمیانی پرتیں بھی وجود میں آ رہی ہیں جو پیٹی بورژوا نظریات کے پھیلاؤ کا منبع ہیں۔ ان میں سے بیشتر رجحانات یوٹوپیائی رنگ رکھتے ہیں کمیونسٹ تحریک خود کو اپنے تک محدود رکھنے کی بجائے دنیا بھر میں مزدوروں، کسانوں، شہری درمیانہ طبقات اور دانشوروں کے درمیان موثر اتحاد کے قیام کے لئے بھرپور جدوجہد کر رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مارکسی لینن کی اس تنبیہہ کو بھی سامنے رکھتے ہیں جس کے مطابق "عوام کے وسیع تر حصّوں کے مزدوروں سے قریب آنے سے محنت کشوں کی حکمت عملی اور طریقہ کار میں بہت سی ترامیم کا بھی امکان ہے جس کے نتیجے میں پرانی غلطیوں کو دھرایا جا سکتا

ہے اور بعض پرانے نظریات اور طریقہ ہائے کار کی جانب پلٹنے کا امکان موجود رہتا ہے۔

پچھلی چند دہائیوں نئے لیفٹ کا تھیسٹ سرمایہ دار ممالک میں انقلابی تحریک کو بدنام کرنے اور ان ممالک میں کمیونسٹ پارٹیوں کی حکمت عملی پر دشنام طرازی کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ان کے پسندیدہ مشاغل میں ترقی یافتہ ممالک کی پرولتاری تحریک میں معروضی طور پر موجود منفی رجحانات (پرولتاریہ کے ایک حصے میں سیاسی مسائل سے عدم دلچسپی اور دائیں بازو کے اصلاح پسند رجحانات سے متاثر ہونا) کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ہے۔ اُن کے مطابق سرمایہ دار ممالک کی پرولتاریہ غیر متحرک اور اپنے "تاریخی فریضے" سے غافل ہو چکی ہے۔ اس طرح کے نتائج اُنہیں اُن بورژوا نظریہ دانوں کی صف میں کھڑے کر دیتے ہیں جن کے خیال میں مزدوروں نے انقلاب کے بارے میں سوچنا بند کر دیا ہے۔

مئی ۱۹۶۸ء میں فرانسیسی محنت کشوں کی جدوجہد کے عظیم اُبھار سے صرف تین ماہ پہلے ٹراٹسکی وادیوں کا اخبار ' VANGUARD ' لکھتا ہے "موجودہ حکمران طبقوں کا استحکام اور انقلابی قوتوں کی کمزوری کے پیش نظر مستقبل قریب میں ایسے کوئی امکانات نظر نہیں آتے جو بورژوازی پر ضرب لگا سکیں" بعد کے واقعات نے اُن کے تجزیے کی دھجیاں بکھیر دیں۔

مزدور طبقے کی ہراول پارٹیوں میں پائے جانے والے بعض منفی رجحانات کا سہارا لے کر وہ ان تنظیموں کی افادیت سے قطعی انکار کرتے ہیں۔ بعض تنظیموں میں جمہوری مرکزیت کی خلاف ورزی کو بنیاد بناتے ہوئے وہ تنظیم میں مرکزیت کو ہدف تنقید بناتے ہیں اور ایک مضبوط مرکزی تنظیم کے زبردست مخالف ہیں۔ ٹراٹسکائیٹ اس طرح مزدور طبقے کو اُس کے سب سے قیمتی سرمائے حیات سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ لینن کے مطابق اقتدار حاصل کرنے کے لئے مزدور طبقے کے پاس تنظیم کے علاوہ کوئی دوسرا ہتھیار نہیں ہے۔ ٹراٹسکی کے پیروکار کمیونسٹوں کے خلاف لڑائی میں اُن نوجوانوں پر بھروسہ کرتے ہیں جو پارٹی سے

باہر ہیں۔ اُن کے مطابق نوجوان انقلاب کے بیرومیٹر ہیں۔ بائیں بازو کے ریڈیکل خیالات رکھنے والے نوجوانوں کو انقلابی تحریک میں بنیادی عنصر کی حیثیت دیجاتی ہے۔ اُسے اس بات کا یقین دلایا جاتا ہے کہ اُسے مزدور طبقے کے انقلابی ہراول دستے کا کردار ادا کرنا ہے جو صرف اسی بات کا منتظر ہے۔ طالب علموں کو محنت کشوں کے انقلابی شعور کا ترجمان قرار دیا جاتا ہے۔

بلاشبہ نوجوان انقلابی تحریک میں ایک نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی مسلم ہے کہ انقلاب طبقاتی جدوجہد کے نتیجے میں برپا ہوتا ہے اور اس میں بنیادی اہمیت اس کے شرکاء کی عمر نہیں بلکہ ان کی طبقاتی پوزیشن ہوتی ہے۔

تمام ٹراٹسکی وادی گروپوں کی دستاویزات اور بیانات میں یہ تکرار موجود ہے کہ جمہوری حقوق کے لئے جدوجہد مزدور طبقے کو سرمایہ داری کے خاتمے کے لئے انقلابی جدوجہد سے دور رکھتی ہے۔ ٹراٹسکائیٹ کمیونسٹوں پر یہ تہمت لگاتے ہیں کہ وہ جدوجہد کو کسی ایک نقطے پر مرکوز کرنے کی بجائے اسے مختلف سمتوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ اس قسم کے نظریات جمہوری تحریک کی جانب ٹراٹسکی وادیوں کے منفی رویّے کی ترجمانی کرتے ہیں، جو عوام کے وسیع تر حصّوں کو اجارہ دار سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد میں کھینچ لاتی ہے اور سوشلسٹ انقلاب کے لئے راستہ ہموار کرنے کا سبب بنتی ہے۔ جمہوری حقوق کے لئے لڑائی کی عدم افادیت ثابت کرنے کے لئے ٹراٹسکائیٹ یہ اعلان کرتے ہیں کہ سرمایہ دار ممالک میں موجودہ سیاسی صورتحال جس نہج پر جا رہی ہے اُس میں جمہوری آزادیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور یہاں پر فاشسٹ نظام بورژوا جمہوریت کی جگہ لینے والا ہے۔ لیکن صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اجارہ دار سرمایہ داری میں فسطائی ہتھکنڈے استعمال کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ عوامی جمہوری قوتیں بھی روز افزوں طاقتور ہوتی جا رہی ہیں جو دائیں بازو کی جانب جھکاؤ

میں زبردست رکاوٹ ہیں۔ ماضی کے مقابلے میں جمہوریت کے دشمنوں کو شکست دینے والی قوتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

ٹراٹسکائیٹ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ جمہوری آزادیوں کے لئے جدوجہد مزدور طبقے کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتی ہے کہ وہ بورژوا ریاست کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی جدوجہد کر سکتے ہیں اور اس طرح وہ پارلیمانی جمہوریت جیسے دلفریب ہتھکنڈوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ مزدور طبقہ سیاسی اور معاشی زندگی کے اُن میدانوں میں روز بروز زیادہ دخل اندازی کرنے لگا ہے جو پہلے صرف بورژوازی کے دائرہ اختیار میں سمجھے جاتے تھے۔ محنت کش ایسے اقدامات اٹھانے کے مطالبے کر رہے ہیں جن میں معیشت کی بنیادی صنعتوں کا قومیایا جانا، کارخانے سے لے کر ملک کے تمام معاملات میں محنت کشوں کی شمولیت اور اُن کا جمہوری بنایا جانا، صنعتوں کا رُخ سماجی ضروریات کی جانب کرنا اور اسلحہ اندوزی کے خاتمے جیسے مطالبات شامل ہیں۔ کیا ان مطالبات کو بورژوا سیاسی ڈھانچوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے؟

انقلابی جدوجہد کی مایہ ناز روایات اور تجربے پر بھروسہ کرتے ہوئے کمیونسٹ سمجھتے ہیں کہ جمہوری حقوق اور سوشلزم کے لئے جدوجہد کے مابین ایک جدلیاتی رشتہ ہے۔ لینن کے الفاظ میں جمہوری حقوق کے لئے جدوجہد کسی بھی طرح سوشلسٹ انقلاب کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے بلکہ ان حقوق کے لئے جدوجہد کے بغیر پرولتاریہ بورژوازی کو شکست دینے کی پوزیشن میں نہیں آ سکتا جب تک وہ جمہوریت کے لئے ہمہ جہتی مسلسل جدوجہد نہیں کرتا۔ لینن پارلیمنٹ کو طبقاتی جدوجہد کا ایک میدان قرار دیتا تھا۔ اجارہ داروں کے خلاف جدوجہد میں لڑائی کی اس شکل کو رد کرنا لینن کے نزدیک بہت بڑی حماقت ہے۔ بورژوا ذرائع ابلاغ اس بات پر اپنی مسرت نہیں چھپا پاتے جب ٹراٹسکائیٹ مزدور طبقے کی وسیع تر تنظیموں میں اس نعرے کے ساتھ گھستے ہیں کہ کسی بھی قیمت پر کمیونسٹ پارٹیوں کی

انتخابی مہموں میں شریک نہ ہوا جائے۔

ٹراٹسکی وادی اُس وقت معروضی طور پر اجارہ دار بورژوازی کے آلۂ کار بنتے ہیں جب وہ اجارہ دار دشمن متحدہ محاذ بنانے کی مخالفت کرتے ہیں۔ اپنے وقت میں ٹراٹسکی نے بھی یورپ میں فاشسٹ دشمن متحدہ عوامی محاذ بنانے کی سخت مخالفت کی تھی اور اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ اس طرح کے متحدہ محاذوں میں قیادت ہمیشہ دائیں بازو کے پاس رہتی ہے۔ اُس کے پیروکار اُسی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اجارہ دار دشمن اتحاد طبقاتی جدوجہد کی شدت کو کم کرتا ہے اور اس طرح سوشلسٹ انقلاب کو مزید دور کرتا ہے۔ اُن کے خیال میں سرمایہ دار ممالک میں ایسی قوتیں موجود نہیں ہیں جو مزدور طبقے کی اتحادی بننے کی اہل ہوں۔

ٹراٹسکی نواز دوسری پرتوں کے ساتھ مزدور طبقے کے اتحاد کو گناہ تصور کرتے ہیں اور اسے انقلابی اصولوں سے روگردانی قرار دیتے ہیں، جبکہ کمیونسٹ متحدہ سامراج دشمن محاذ کی افادیت کو تسلیم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے عہد میں پرولتاریہ کے اہم ترین مفادات اور بحیثیت مجموعی معاشرے کے معاشی اور سیاسی مسائل کے درمیان تعلق مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اس دور میں پرولتاریہ ایک ایسی تاریخی قوت کے طور پر اُبھر رہی ہے جو مجموعی قومی مفاد کو آگے بڑھاتے ہوئے معاشرے کی تمام تر ترقی پسند قوتوں کو اجارہ دارانہ جبر کے خلاف جدوجہد کی ترغیب دیتی ہے۔ اس عمل میں مزدور طبقہ اپنا تشخص بالکل نہیں کھوتا اور اپنے طبقاتی مفادات کی نگہبانی کرتا ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ دار ممالک میں استحصال زدہ پرتوں کو سیاسی جدوجہد کی جانب لاتے ہوئے مزدور طبقہ انقلابی جدوجہد میں قیادت کا فریضہ انجام دینے کے لئے زیادہ سازگار حالات پیدا کرتا ہے۔

مارکسی لیننی سوچ رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ سامراج دشمن محاذ بنانے کا مسئلہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کوئی الجبرے کا فارمولا نہیں ہے جس میں اجارہ داروں کے خلاف کمربستہ تمام قوتوں کو جمع کر دیا جائے۔ اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایسی مشترکہ شعوری

کوششوں کی ضرورت ہے جو سرمایہ دارانہ معاشرے کی مختلف سماجی پرتوں کو ایک لڑی میں پروتے ہوئے اس پر کاری ضرب لگا سکیں۔

ٹراٹسکی کے پیروکار انقلاب کے لئے جدوجہد کے پرامن ذرائع استعمال کرنے کو موجودہ کمیونسٹ تحریک کی اختراع قرار دیتے ہیں جس کی ماضی میں کوئی مثال نہ ہو۔ وہ یہ ثابت کرنے پر کمربستہ ہیں کہ عوام کی انقلابی سرگرمی کا انحصار سخت جان انقلابیوں کے گروہوں پر ہیں جو انقلاب برپا کر سکتے ہوں۔ انقلابی جدوجہد کی معروضی حقیقتوں اور اسے پیش آنے والے روزمرّہ کے مسائل اور ضروریات کا ادراک کئے بغیر وہ "پیٹی بورژوا انقلابیت" کا شکار ہوتے ہیں، جو ہمیشہ فیصلہ کن گھڑی میں وار کرنے کی طرف بلاتا ہے اور روزمرّہ کی جدوجہد میں شریک نہیں ہونا چاہتا جو اس فیصلہ کن مرحلے کے لئے تیاری کرنے اور اسے قریب سے قریب تر لا سکے۔

"سب کچھ یا کچھ نہیں" کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے یہ انقلابی اُن شاندار فیصلہ کن زمانوں کا انتظار کرنے کے بہانے سیاسی بے عملی کا شکار بنتے ہیں۔ فرانسیسی ٹراٹسکی نواز کرلوین کہتا ہے "مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس یا اُس اصلاح کے لئے لڑا جائے تاکہ تنخواہ میں چند فیصد اضافہ ہو سکے بلکہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ اس معاشرے کو مکمل طور پر بدلا جائے اور مرکزی حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے"۔ اس طرح کے نظریات کس قدر نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ مئی جون ۱۹۶۸ء میں فرانس میں ٹراٹسکی وادیوں کے اعمال سے ہوا۔ اُنہوں نے "فوری مسلح بغاوت" کا نعرہ دیا جس کے لئے مزدور طبقہ ابھی تیار نہیں تھا مسلح افواج اور استحصالی قوتیں ایسے ہی موقع کی تلاش میں نہیں تاکہ تحریک پر قابو پایا جاسکے

ٹراٹسکی کے پیروکار مزدور طبقے کی جدوجہد میں وقتی اصلاحات اور حتمی نصب العین کے مابین جدلیاتی رشتے کا ادراک نہیں رکھتے۔ ۱۹۶۵ء میں پیرس سے جاری کردہ "دوسرے کمیونسٹ مینی فیسٹو" میں قومیائے جانے کی پالیسی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں "کسی بھی ملک

میں، جہاں قومیائے جانے کا عمل واقع ہوتا ہے بشک وہ کوئی سرمایہ دار ملک ہو یا سوشلسٹ، اُس میں سرمایہ دارانہ معیشت کے عمومی رجحانات پائے جاتے ہیں،،۔ ،،مکمل آزادی،، کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ اوپر کی جانب سے کسی بھی قسم کی مداخلت کے خلاف ہیں۔

سرمایہ دار ممالک میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا تجزیہ نہ کرنے کی سکت اُنہیں اس نتیجے کی جانب لے جاتی ہے کہ صرف ایک زبردست معاشی بحران ہی انقلاب کو آگے بڑھا سکتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں پیرس کی سیکریٹریٹ کھلے عام اعلان کرتی ہے کہ معاشی بحران کے نتیجے میں یورپی اور امریکی محنت کشوں کا گرتا ہوا معیار زندگی انقلاب کے لئے بہت سازگار حالات پیدا کر رہا ہے۔ اُن کے مطابق ،،جتنا بُرا بحران ہوگا انقلاب کے لئے اُتنا ہی اچھا ہوگا،،۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تباہ کن معاشی بحران (سرمایہ دارانہ معیشت کے پچھلے ۱۴۰ سالوں میں ایسے ۱۴ بحران نمودار ہوئے) محنت کشوں پر بدترین اثرات مرتب کرتے ہیں اور بلاشبہ اُنہیں انقلاب کی جانب لاتے ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ بحران انقلابی عمل کیلئے واحد لازم وملزوم شرط ہے۔ ایسے بحرانوں نے ہمیشہ انقلاب کو جنم نہیں دیا۔ ۲۰ء کے عشرے میں جس بدترین معاشی بحران نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے، جب اس بحران کے بطن سے فاشزم نے جنم لیا۔ ٹراٹسکی وادیوں کے برخلاف کمیونسٹ مزدور طبقے کی انقلابیت کو اُن کے مصائب و آلام سے مشروط نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ داری کے نسبتاً زیادہ مستحکم ادوار میں بھی جمہوری مطالبات گہری ہمہ گیر سماجی اصلاحات اور سوشلزم کے لئے انقلابی جدوجہد کے امکانات کم نہیں ہوتے۔

گزشتہ کچھ عرصے سے ٹراٹسکی کے بہت سے ماننے والے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ نوآبادیات میں رونما ہونے والے انقلابات ہی سامراج کو فیصلہ کن ضرب لگانے کے اہل ہیں چونکہ باقی دنیا میں انقلابی تحریک بحران کا شکار ہے۔ یہ تھیسس پہلی بار ۱۹۵۷ء میں چوتھی انٹرنیشنل کی کانگریس میں سامنے آیا۔ ان انقلابات کو عالمی انقلاب کی کنجی قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ

عالمی انقلابی تحریک کا بنیادی مرکز ایک خاص مدت کے لئے نوآبادیاتی ممالک میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس طرح انہوں نے ٹراٹسکی کے اس بنیادی نظریے سے یکدم قلابازی لگائی جس کا خیال تھا کہ سامراج کی حکمرانی میں قومی آزادی کی جدوجہد کے فتحیاب ہونے کے زیادہ امکانات نہیں ہیں۔ ٹراٹسکی وادیوں کے برخلاف مارکسی پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ماضی کی طرح آج بھی انقلاب کے تعین کا پیمانہ کسی ملک کی معیشت کی ترقی کا درجہ نہیں ہے۔ سوشلسٹ انقلاب کے لئے فیصلہ کن عنصر اُن معروضی و موضوعی حالات کا موجود ہونا ہے جو اسے پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یہ حالات ترقی کے مختلف مدارج پر واقع ممالک میں رونما ہو سکتے ہیں۔

چوتھی انٹرنیشنل کے رہنما اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اپنے طبقاتی حریف کی کمزوری کی وجہ سے پسماندہ ممالک میں انقلابی جدوجہد کے امکانات زیادہ وسیع ہیں۔ لیکن کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایشیا، اور افریقہ میں قومی آزادی کی جدوجہد لڑنے والی قوتوں کا مقابلہ کم طاقتور حریف سے ہو رہا ہے۔ ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک ہوں یا پسماندہ ممالک، اُن کا مقابلہ ایک ہی قوت سے ہے اور وہ ہے سامراج، اجارہ دار سرمایہ دار۔ بلکہ کچھ ترقی پذیر ممالک جہاں مزدور طبقہ ابھی نسبتاً کمزور ہے، میں تو سامراج دشمن قوتیں اور بھی کمزور ہیں اور اُن کے پاس انقلابی جدوجہد کا وہ تجربہ بھی نہیں ہے جو ترقی یافتہ ممالک کی مزدور تحریک کا سرمایہ حیات ہے۔ ٹراٹسکی وادی سرمایہ دار ممالک کی مزدور تحریک کو اس لئے بھی مطعون کرتے ہیں کیونکہ ان کے مطابق وہ قومی تحریک آزادی کی خاطر خواہ مدد نہیں کر رہی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مغرب میں مزدور تحریک کا ایک حصہ اپنے حکمران طبقات کے نظریاتی جال سے نکل نہیں پایا لیکن مارکسی پارٹیاں بڑی تندہی سے عوام کے وسیع تر حصوں کو تحریک آزادی کی حمایت میں میدان میں لا رہی ہیں۔

ٹراٹسکایٹ سامراج مخالف اور جاگیردار دشمن انقلاب کی اصطلاح کو بھی رد کرتے ہیں اور اپنی تمام تر توجہ سوشلزم کے لئے فوری جدوجہد پر مرکوز کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں انقلاب کو درجوں میں تقسیم کرنا ترمیم پسندی اور موقع پرستی ہے اور سوشلسٹ انقلاب برپا کرنا وقت کی

فوری اہم ترین ضرورت ہے۔ اُن کے نزدیک مزدوروں کا سب سے بڑا دشمن قومی بورژوازی ہے۔
سامراج کو شکست دینے کا واحد راستہ قومی بورژوازی کے اقتدار کا خاتمہ ہے جبکہ چلی اور بعض دیگر
ممالک میں انقلابی جدوجہد کا جائزہ لینے والے مارکسیوں کے نزدیک قومی بورژوازی کے بعض حصّے
سامراج دشمن تحریک میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ بعض دوسرے ممالک میں جہاں
قومی بورژوازی نے سامراج کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو ترجیح دی، کمیونسٹوں نے انہیں انقلاب کی
متحرک قوتوں میں شامل کرنے کا اہل نہیں سمجھا۔ بلکہ اُنہوں نے قومی بورژوازی کو بے اثر
NEUTRALISE کرنے کا فریضہ ہاتھ میں لیا۔

حقائق اس بات کے گواہ ہیں کہ ٹراٹسکی وادیوں کا مارکسیوں پر یہ الزام کہ وہ قومی بورژوازی
میں سمجھوتہ بازی کے رجحانات سے مفاہمت کرتے ہیں بالکل لغو ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ
اس کے مقابلے میں کیا تجویز پیش کرتے ہیں؟ اُن کے مطابق ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ
میں سیاسی صورتحال سے قطع نظر انقلابیوں کا مطمح نظر مسلح جدوجہد ہونی چاہیئے۔ بیشتر ممالک
میں ٹراٹسکی وادیوں کا نعرہ REVOLUTION YES,ELECTION NO ہوتا ہے۔

ٹراٹسکی وادی جنگ کو انقلاب کی ماں قرار دیتے ہیں۔ اس تعبیر کی بنیاد پر کمیونسٹ پارٹیوں
کی جانب سے فاشسٹ جنگ کے خطرے کے خلاف جدوجہد کو عالمی انقلاب سے غداری قرار دیا
گیا۔ عالمی مزدور تحریک کی جانب سے امن کے لئے جدوجہد پر بھی مختلف طرح کے الزامات لگائے
جاتے ہیں۔ ایسے بورژوا امن پسندی PACIFISM سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ تاشقند میں
ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ختم کرانے کی سوویت کوششوں پر بھی کڑی تنقید کی جاتی
ہے جو اُن کے مطابق سامراجی چھتر چھایا میں کروائی گئی تھی۔ اُن کے مطابق ہندوستان اور
پاکستان کے درمیان اس جنگ کے بڑھنے کے نتیجے میں دونوں ملکوں کی بورژوازی کے لئے شدید
مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں اور انقلابی صورتحال کے پیدا ہونے کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے۔
ٹراٹسکی وادی ویتنام میں امن کے نعرے کی بھی بھرپور مخالفت کرتے رہے ہیں اور اسے انقلابی

جدو جہد سے انحراف اور عالمی انقلاب سے غداری قرار دیتے رہے ہیں۔ اُن کے خیال میں ویتنام میں امن کے نعرے کو پرولتاریہ نے مسترد کر دیا ہے۔ اُن کے نزدیک ہر ملک کی پرولتاریہ کیلئے ویتنامی انقلاب کی مدد کا واحد طریقہ ان ممالک میں سرمایہ داری کا تختہ اُلٹنے میں ہے۔

چوتھی انٹرنیشنل کے تمام دھڑے اس بات پر متفق ہیں کہ امن کے لئے مزدوروں کی جدوجہد یوٹوپیائی ہے اور بورژوا نظریاتی رجحانات سے مفاہمت کی کوشش ہے۔ وہ امن کے لئے جدوجہد کو ریڈیکل رخ دینا چاہتے ہیں اور اُسے سماجی انقلاب کی جانب موڑنا چاہتے ہیں۔ عالمی امن تحریک سے نکلنے پر مجبور کر دیا جائے جو جوہری جنگ کے خطرے کے خلاف ہوتے ہوئے اس جدوجہد میں آتے ہیں اور سوشلسٹ نظریات کے حامل نہیں ہوتے۔ ۱۹۶۲ء میں ہیلسنکی میں نوجوانوں کے میلے میں انہوں نے جو پمفلٹ تقسیم کئے اُن پر لکھا تھا کہ دنیا میں اُس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک بڑے سرمایہ دار ممالک میں سوشلسٹ انقلاب برپا نہیں ہو جاتا، اس لئے امن قائم کرنے کا واحد ذریعہ عالمی انقلاب برپا کرنا ہے۔

منظم مزدور تحریک کی صفوں میں پٹنے اور نکالے جانے کے بعد ٹراٹسکی وادی اپنی انقلاب دشمن سرگرمیوں کے لئے نئے ہتھکنڈے اور طریقہ کار اپنا رہے ہیں۔ ENTERISM کی اصطلاح پارٹیوں اور عوامی تنظیموں میں چور دروازے سے داخل ہونے کو کہا جاتا ہے جس میں بظاہر ان تنظیموں کے پروگرام اور مقاصد سے اتفاق کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن پس پردہ ان تنظیموں اور مزدور تحریک کو مجموعی طور پر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

پچھلے کچھ عرصے سے مغربی سرمایہ دار ممالک میں بالخصوص نیو لیفٹ کے دانشوروں اور باغی طالب علموں میں تنقیدی اور یوٹوپیائی نظریات پروان چڑھ رہے ہیں نظریاتی جدوجہد میں مارکسی لینی سوچ سے مسلح نظریہ دانوں کا بنیادی فریضہ ان نظریات کی جڑوں اور غیر سائنسی بنیاد کی بیخ کنی ہے جو مزدور طبقے کو اس کے تاریخی فریضے سے غافل کر رہے ہیں اور جدید سرمایہ داری سے پرولتاریہ کے تعاون INTEGRATION کے بارے میں بے بنیاد

مفروضات کا پہاڑ کھڑا کر رہے ہیں اور سماج کے مختلف حصّوں پر اُن کے اثر و نفوذ کی وجوہات دریافت کی جائیں۔

ان نظریات میں مارکیوزے کی تنقیدی تھیوری کو اہم حیثیت حاصل ہے جس کے نظریات امریکہ، فرانس اور جرمنی میں ریڈیکل نوجوانوں اور طالب علموں میں کافی مقبول ہیں۔ پہلی نظر میں مارکیوزے سرمایہ دارانہ نظام پر کڑی تنقید رکھنے والا دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے مطابق امریکہ میں ایک ایسی سماجی ریاست وجود میں آ رہی ہے جو یک رُخی ONE DIMENSIONAL ہے۔ مارکیوزے کہتا ہے کہ امریکہ اور مغربی یورپ میں ایک ایسے نظام کو وجود میں لایا جا رہا ہے جو پیداوار انتظامیہ اور تعلیمی اداروں کو باہم مربوط کرتے ہوئے ایک ایسے یک رُخے اور سخت گیر معاشرے کو جنم دے رہا ہے جو ایک فرد کی زندگی اور رویوں کو متعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کرے گا۔ اُس کے مطابق یہ طاقتور، مضبوط نظام لوگوں کے دلوں اور ذہنوں پر حکمرانی کرتے ہوئے انہیں SOCIAL CONFORMISM کے جذبے میں ڈھال رہا ہے۔

معاشرے کے افراد کو موجودہ نظام میں سمونے کے لئے جو اسٹینڈرڈ طریقے اور قدریں بنائی جا رہی ہیں اُنہیں لوگوں کی اندرونی ضروریات کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس طرح اس یک رُخے معاشرے میں ایک ایسا یک رُخا انسان ڈھالنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں جو یک رُخی سوچ رکھتا ہے اس معاشرے میں ایسی قوتوں کی حکمرانی ہے جن پر ایک فرد کوئی اختیار نہیں رکھتا ہے۔ امریکہ اور مغربی یورپ میں پیداواری ڈھانچہ انسان کو محکوم بناتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ڈھانچہ اُن لوگوں کی زندگی کو تباہ کرنے کے درپے ہے جو ان آلات کو پیدا اور استعمال کرتے ہیں۔ مارکیوزے کو جو بات بہت سے دوسرے لبرل اور اصلاح پسند دانشوروں سے علیحدہ کرتی ہے وہ ہے اس کا سرمایہ دارانہ نظام کی انقلابی تباہی پر پرزور اصرار۔ لیکن ہماری بنیادی توجہ اُس کی ہمدردیوں یا خواہشات پر نہیں بلکہ اُس کے ان تجریدی نظریات کے معروضی مافیہ پر ہے جنہیں وہ معاشرے کی تھیوری کے نام پر پیش کرتا ہے۔ مارکیوزے جدید سوسائٹی کو ترقی یافتہ صنعتی معاشرہ کہتا ہے اور اس

میں ذرائع پیداوار سے تعلقات کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتا۔ اس طرح وہ سوشلزم اور جدید سرمایہ داری میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ یہ نظریہ جدید دور کی نظریاتی جدوجہد میں ایک مخصوص کردار ادا کرتا ہے اور عام عوام سے سرمایہ دارانہ تعلقات کے بنیادی وصف یعنی نجی ملکیت کی حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

مارکیوزے کے نظریات میں بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ جدید معاشرے کی تمام تر خرابیوں کا ذمہ دار صنعت اور سائنسی ترقی کو سمجھتا ہے۔ اس طرح وہ سماجی و معاشی اور طبقاتی تعلقات کی تبدیلی کو ثانوی حیثیت دیتا ہے۔ اُس کے خیال میں سماجی ترقی کی معروضی منطق LOGIC میں یہ تعلقات نسبتاً کم اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ بالکل بجا طور پر اس معاشرے کو انسانیت کی مجموعی قدروں کے اعتبار سے خلاف عقل IRRATIONAL قرار دیتا ہے جو انسان کو بے تنگی جنون میں دھکیل کر اُس کے اندر کے انسان کو مارنا چاہتا ہے۔

مارکیوزے کے مطابق جدید سرمایہ داری خود کو مستحکم رکھنے اور سماجی تبدیلی کو روکنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ یہ معاشرے اور ریاستیں اپنے دامن میں بہت سے متحارب اور متضاد عناصر کو جمع کیے ہوئے ہیں، جن میں تمام بنیادی طبقات مثلاً بورژوازی اور پرولتاریہ شامل ہیں۔ استحصال زدہ طبقے کا ہر فرد اس سیاسی کل سے جڑا ہوا ہے اُس کے مطابق صنعتی طور پر ترقی یافتہ معاشرہ لازمی طور پر صارفین کا معاشرہ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں معیار زندگی میں شدید ترین تضادات اُس کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں، وہ مغربی یورپ اور امریکہ میں بہتر معیار زندگی کے لئے محنت کشوں کی جدوجہد کو بھی ایک ہی رخ سے دیکھتا ہے اور اسے صارفین کے رویوں سے تشبیہہ دیتا ہے، جبکہ یہ قطعی ضروری نہیں کہ ان معاشروں میں محنت کشوں کے تمام تر مطالبات کی بنیاد صارفین کی حیثیت سے اپنی پوزیشن بہتر بنانے ہی سے ہو۔ مارکیوزے کے یہ نظریات اُسے بائیں بازو کے اُن فتنہ انگیز مقرروں DEMAGOGUES کی صف میں کھڑے کر دیتے ہیں جن کے مطابق لوگ جتنی تکلیف برداشت کریں گے،

انقلاب کے لیے اتنا ہی مفید ہو گا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اس کی کتاب ONE DIMENSIONAL MAN ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے "معاشرے کی تنقیدی تھیوری ایسے تصورات سے عاری ہے جن کے ذریعے حال اور مستقبل کے درمیان فاصلے کو کم کیا جا سکے۔ کسی بھی اُمید اور کامیابی کی عدم موجودگی میں یہ تھیوری منفی ہی رہتی ہے۔ یہ صرف اُنہی لوگوں سے وفادار ہے جو اپنی زندگی اس عظیم انکار کے نام وقف کر چکے ہیں"۔ اپنی زیادہ تر تحریروں میں مارکیوزے یہ بات مانتا تھا کہ اُسے جدید دنیا میں ایسی حقیقی سماجی قوتیں دکھائی نہیں دیتیں جو اس معاشرے کو تبدیل کر سکیں۔ البتہ وہ سماج کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں بے روزگاروں، طوائفوں اور رنگدار نسل کے لوگوں سے اُمید ضرور وابستہ کرتا ہے چونکہ یہ لوگ اس پورے نظام میں کہیں فٹ نہیں ہوتے۔ جدید پرولتاریہ اس پورے نظام میں ضم ہو چکی ہے اور اپنے انقلابی کردار سے غافل ہو چکی ہے۔ البتہ فرانس میں ۱۹۶۸ء کے واقعات میں وہ پرولتاریہ کے انقلابی کردار کے بارے میں زیادہ پُر اُمید تھا۔ مارکیوزے کی پوری سوچ سائنسی بنیادوں پر استوار ہونے کی بجائے فوری واقعات پر ہونے والے رّدعمل پر مبنی نظر آتی ہے۔

سرمایہ دار معاشرے کو سوشلسٹ معاشرے میں تبدیل کرنے کے انتظامی اقدامات کا جائزہ لیتے ہوئے مارکیوزے ایسی اصلاحات تجویز کرتا ہے جو اس معاشرے کی جڑوں تک پہنچنے میں ناکام رہتی ہیں۔ مثلاً زرعی علاقوں کی بازیافت، سماجی خدمات اور صحت کے اداروں کا فروغ، شہری ٹرانسپورٹ کی بہتری یا بعض اوقات ایسے اقدامات کا مطالبہ کرتا ہے جو جدید انسان کی ضروریات (ریفریجریٹر، ٹی وی، کار وغیرہ) کو یکسر ختم کر دیں، جو کوئی یوٹوپیائی ہی تجویز کر سکتا ہے۔

سرمایہ دار ممالک میں مزدور طبقے کی چند پارٹیاں (ہسپانوی اور اطالوی) بعض ایسے نظریاتی تصورات کا پرچار کرتی ہیں جو کافی متنازعہ ہیں۔ ان رجحانات میں خاص

طور پر یہ نظریہ اہمیت کا حامل ہے جس کے مطابق ان ممالک میں سوشلزم حقیقی طور پر جمہوری طریقے سے برپا کیا جائے گا۔ یہاں پر غور طلب بات یہ ہے کہ مسئلہ کو کس طرح پیش کیا جاتا ہے۔ اس بات سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ سرمایہ داری کے راج کا خاتمہ کرنے کے لئے اب تک جو راستے استعمال کئے گئے ہیں وہ جمہوری نہیں تھے یا کافی جمہوری نہیں تھے۔ لیکن کیا عوامی اُبھار غیر جمہوری طریقہ ہے۔ کوئی بھی طریقہ جس کے ذریعے استحصالی اقلیت کو اقتدار سے علیحدہ کیا جاتا ہے اور استحصالی زدہ اکثریت برسرِ اقتدار آتی ہے کو حقیقی طور پر جمہوری ہی ماننا چاہیئے۔

فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کی ۲۳ ویں کانگریس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ یہ کہنا ایک اور بات ہے کہ جمہوری طریقہ جدوجہد کی بہت سی شکلوں میں سے ایک ہے جس کے ذریعے سماجی اور سیاسی قوتوں کا توازن مزدور طبقے کے مفاد میں کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا بہت مختلف بات ہوگی کہ سوشلزم کی جانب بڑھنے والی جمہوری راہ ہی وہ واحد راہ ہے جس کے ذریعے ہر مرحلے پر ترقی کے اہم ترین مسائل کو صرف الیکشن کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کا زاویہ نظر بہت سے سوالات کو جنم دیتا ہے، یہ ہمارے طبقاتی دشمن کی طاقت کو کم کر کے دیکھنا ہوگا جو جمہوریت اور سوشلزم کے خلاف اپنے بھرپور وسائل استعمال کرنے کا اہل ہے۔ سب کے لئے مکمل آزادی اور جمہوریت کا آیا یہ مطلب لینا صحیح ہوگا کہ اس نظام میں استحصالی اور رجعتی قوتوں کو بھی مکمل آزادی ہوگی۔ کیا بورژوا جمہوری اقدار کی بے جا پیروی انقلاب کے کٹھن اور دشوار مراحل میں اپنے طبقاتی دشمن کو یہ موقع فراہم کرنا نہیں ہوگا کہ وہ دوبارہ اپنا استحصالی نظام نافذ کر سکیں ؟ کیا رجعتی قوتیں ہر مرحلے پر انقلابیوں کو اس بات کی اجازت دے دیں گی کہ صرف اور صرف عام انتخابات کے ذریعے وہ اپنی شکست تسلیم کر لیں ؟ کیا ان عام انتخابات میں دھاندلیوں کی کوشش نہیں ہوگی ؟ کیا الیکشن کے علاوہ جدوجہد کی دوسری شکلوں کی تلاش ضروری نہیں ہے جو بورژوازی کو

عوام کی مرضی تسلیم کر لینے پر مجبور کر سکے ؟

"جمہوری سوشلزم" کا پرچار کرنے والے اس تاریخی حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ جمہوری قدروں کا احترام کرنا بورژوازی کا شعار اُس وقت تک ہی رہتا ہے جب تک اُس کے اقتدار کو براہ راست خطرہ لاحق نہیں ہو جاتا۔ بہت سے ممالک میں انقلابی صورتحال کو کچلنے کیلئے فوج اور دوسرے فاشسٹ ہتھکنڈوں سے کام لیا گیا، سوشلسٹ انقلاب کے بعد بورژوازی کو جمہوری حقوق نہیں دیئے جا سکتے، بالکل اُسی طرح جیسے بورژوا انقلاب میں جاگیرداروں کو ایسے کوئی حقوق حاصل نہیں تھے۔ سوشلسٹ انقلاب کی اصل خصوصیت ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت کا خاتمہ ہے۔

ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا جاتا ہے کہ ریڈیکل جمہوری تبدیلیاں ہی "سوشلزم کے عناصر" ہیں اور سوشلزم کو جمہوری آزادیوں کے کمیتی ارتکاز سے حاصل کیا جا سکتا ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام کی کیفیت کو تبدیل کرنا لازمی نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر بعض جمہوری آزادیوں کے حصول کو سوشلسٹ آزادیوں کا نام دے دیا جاتا ہے جبکہ صرف پرولتاری جمہوریت ہی وہ واحد طاقت ہے جو ان جمہوری آزادیوں کو سوشلسٹ حقیقت کا روپ دے سکتی ہیں۔

اطالوی کمیونسٹ اپنی حکمت عملی کو سوشلزم کے لئے تیسری راہ کا نام دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے ملک میں یہ تبدیلیاں اُن انقلابات سے بہت مختلف ہوں گی جو سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں میں رونما ہوئے ہیں یہ ہر قوم کا اصولی حق ہے کہ وہ اپنے معاشرے میں سوشلزم کے قیام کے مخصوص راستے کا تعین کرے۔ پچھلے انقلابات کے تجربات کسی نئے انقلاب پر جوں کے توں لاگو نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن جیسا کہ مختلف ممالک میں انقلابی جدو جہد کا تجربہ بتاتا ہے کہ ہر کامیاب انقلاب اپنی مخصوص خصوصیات کے ساتھ ساتھ بعض ہمہ گیر خصوصیات بھی رکھتا ہے۔ ان مشترکہ خصوصیات

اور دوسرے ملکوں میں انقلابیوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کو نظر انداز کرنا انقلابی مقصد کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور اسے ناکامی سے دوچار کر سکتا ہے۔ "تیسری راہ" کے ماننے والے "حقیقی سوشلزم" کو اس لئے بھی رد کرتے ہیں کہ اُن کے خیال میں یہ زیادہ جمہوری نہیں ہے۔ وہ ان ممالک میں سوشلزم کے قیام کو تاریخی تناظر میں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان نظریہ دانوں کے تنقیدی نقطہ نظر کی بنیاد سوشلزم کے ایسے ماڈل سے ہے جو یہ مستقبل میں بنانا چاہتے ہیں۔ اُن کے مطابق سوشلزم کے تحت ریاستی اور نجی شعبوں کو ایک لمبے عرصے تک برقرار رہنے دیا جائے گا اور ایک ایسی اپوزیشن کو بھی برقرار رکھا جائیگا جو دوبارہ حکمران قوت بننے کی اہل ہو یعنی سرمایہ داری کو واپس لا سکتی ہو۔

لیکن بہت سی پارٹیاں اس سے مختلف رائے رکھتی ہیں۔ اُن کے مطابق مستقبل کے سوشلزم کے کسی بھی نظریے کو سوشلسٹ ممالک کے حقیقی تجربے کے خلاف کھڑا کیا جانا درست نہیں ہے۔ جہاں تک پرولتاریہ کے اقتدار میں آنے کے بعد کسی بورژوا پارٹی کو اقتدار واپس دینے کے امکان کا سوال ہے تو یہ سوشلسٹ کامیابی سے انحراف ہوگا۔ سوشلزم سماجی ترقی کی اتنی زبردست کامیابی ہے کہ عوام اس کے دفاع سے انکار کو کبھی سمجھ نہ پائیں گے۔ البتہ ایسے انقلاب میں پرولتاریہ اور اس کے حلیفوں کو بھرپور جمہوری آزادیاں حاصل ہوں گی۔

* * *

اس مضمون کا مقصد اُن بنیادی عوامل اور خاص واقعات کو اختصار سے پیش کرنا تھا جو گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں عالمی مزدور تحریک کو اُس کے موجودہ مرحلے تک لائے ہیں۔ اس عرصے میں وہ عظیم سماجی قوت وجود میں آئی ہے جو انسانیت کو نہ صرف سرمایہ داری کے استحصال سے نجات دلا رہی ہے بلکہ صدیوں پر محیط طبقاتی معاشرے کی بنیادوں کو جڑوں سے ہلا رہی ہے۔ تعداد کے اعتبار سے چھوٹے سے صاحب جائیداد طبقے کے ہاتھوں محنت کرنے والوں کا صدیوں پرانا استحصالی نظام اپنے انجام کو پہنچ رہا ہے

اور وہ نظام بھی ختم ہو رہا ہے جس کے تحت "مہذب نوآبادکار" ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کروڑوں عوام کو لوٹتے تھے۔

لیکن تاریخی ترقی کا راستہ ہموار نہیں ہے۔ اس میں گڑھے اور کھائیاں ہیں۔ تاریخ کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر دنیا کے محنت کش رجعت پرستی کی قوتوں کی مزاحمت پر قابو پانا چاہتے ہیں تو انہیں شدید نظریاتی اور عملی جدوجہد کرنی ہوگی۔ مارکسزم کبھی بھی خود کو جدوجہد کے اُن طریقوں یا ذرائع تک محدود نہیں رکھتا جو ایک خاص وقت میں ممکن ہیں یا وجود رکھتے ہیں۔ جیسے جیسے سماجی تبدیلی کا عمل ترقی کرتا ہے، جدوجہد کی نت نئی شکلیں دریافت ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں مارکسزم عوام کے عمل سے اپنی تھیوری کو مالامال کرتا ہے اور اس طرح کا کوئی دعوی نہیں کرتا کہ وہ عوام کو یہ شکلیں سکھاتا ہے جو بیٹھکوں میں دریافت کی گئی ہیں۔

تاریخ کی اس پرپیچ طویل شاہراہ پر محنت کش نئے اُفق دریافت کر رہے ہیں اور انسان ایک نئے عہد میں قدم رکھ رہا ہے۔ اُس کے سامنے اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لامحدود نئے امکانات پیدا ہو رہے ہیں اور وہ بڑی پراعتمادی سے ان نئی وادیوں کو سر کرنے کے لئے بیتاب ہے۔

* * *

یہ مضمون مندرجہ ذیل کتابوں کی مدد سے لکھا گیا۔

۱۔ ڈبلیو زیڈ فاسٹر۔ عالمی مزدور تحریک۔ پہلا حصہ ترجمہ عبدالحمید

۲۔ پروفیسر مانفرید۔ مختصر تاریخ عالم۔ دوسری جلد۔ ماسکو، ۱۹۸۰ء

3. KUSKOV Y., LENINISM AND THE WORLD REVOLUTIONARY WORKING CLASS MOVEMENT, M, 1976.

4. THEORY AND TACTICS OF THE INTERNATIONAL COMMUNIST MOVEMENT, MOSCOW, 1976.

5. OSADCHAYA, MODERN LABOURISM- IDEOLOGY AND POLITICS, M, 1977.

6. NIKITIN V.A., A CRITIQUE OF THE IDEOLOGY OF DEMOCRATIC SOCIALISM, M, 1978.

7. BATALOV E., PHILOSOPHY OF REBELLION,M, 1973.

8. MANDEL E., REVOLUTIONARY MARXISM TODAY,NLB,1979

9. WORLD FEDERATION OF TRADE UNIONS. 1945-1985, PRAGUE., 1985.

10. BASMANOV M., ANTIREVOLUTIONARY ESSENCE OF MODERN TROTSYISM, M, 1971.

11. INTERNATIONAL WORKING CLASS MOVEMENT- REFERENCE BOOK, M, 1977.

12. MOSKVIN L., THE WORKING CLASS AND ITS ALLIES M, 1977.

13. ULYANOVSKY R., COMINTERN AND THE EAST,M,1984.

14. THE INTERNATIONAL WORKING CLASS MOVEMENT, Vol 1-4, M, 1984-85.

* * *

ٹارچر: چند عمومی اور خصوصی نفسیاتی پہلو

فرنانڈو اچیبرس

اس مضمون میں ریاستی سیاسی ایذارسانی کے کچھ عمومی اور خصوصی پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے، جن کا استعمال کئی لاطینی امریکی ممالک میں کیا جاتا ہے تاکہ آمرانہ تسلّط کو قائم اور تبدیلی کو روکا جاسکے۔ نیز ایسی ایذارسانی کے مقاصد، طریقہ کار اور اثرات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ مضمون میں اُن چند عوامل کی بھی وضاحت کی گئی ہے جو ایک شخص کو ایذارساں بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ خود ایک ایذارساں کن تضادات کا شکار ہوتا ہے اور ان تضادات کو حل کرنے کے لئے وہ کن نفسیاتی حربوں کو استعمال کرتا ہے۔ ان امور کا بھی اس مطالعہ میں جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حقیقتاً ایذارساں کون ہے؟

ہم ایذارسانی کی تعریف یوں کرسکتے ہیں کہ یہ تشدد کی وہ شدید اور سوچی سمجھی صورت ہے، جس میں سے گزرنے والا شخص اُسے شعوری طور پر محسوس کرتا ہے۔ مگر اسکا تشدد کے اس تجربے کی نہ تو نوعیت پر اور نہ ہی دورانیے پر کوئی کنٹرول ہوتا ہے۔ اس سے تکلیف درد اور ذہنی و نفسیاتی دباؤ STRESS پیدا ہوتا ہے جس کا مقصد اُس شخص کی قوت ارادی کو توڑنا ہوتا ہے تاکہ قوت و اختیار کے نظام کے متعین کردہ تعلقات کا تسلسل یقینی بنایا جاسکے۔ جب یہی طریقے ایک ریاست قوم کے افراد کو مغلوب کرنے کے لئے اختیار کرتی ہے تو اسے ریاستی ایذارسانی کہا جاسکتا ہے لیکن جب ان ہتھکنڈوں کا بنیادی نشانہ وہ شہری ہوں جو ریاست کیجانب سے بنائے ہوئے رشتوں کے نظام کے مخالف ہوں یا جن پر مخالفت کا شک ہو تو ہم اس طریقہ کار کو ریاستی سیاسی ایذارسانی قرار دے سکتے ہیں۔ براعظم امریکہ کے کئی ممالک میں ایذارسانی کا استعمال انتظامی پالیسی کی

حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن چلی، یوروگوائے، ارجنٹائن، پیراگوئے، ایل سلواڈور اور گوئٹے مالا پچھلے دس سال میں خصوصی حیثیت اختیار کر گئے ہیں ان ممالک میں ہزاروں شہریوں کو جو اپنی حکومتوں کے مخالف ہیں، ایذا رسانی کے نیم خفیہ مراکز میں ایذا دی جاتی رہی ہے اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہاں اذیت کے تقریباً ایک جیسے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایذا رسانی کیلئے لوگوں کی شناخت اور حبادٔ فوج کے مختلف شعبے کرتے ہیں۔ اور پھر انہیں "سادہ لباس میں ملبوس مسلح افراد" اغوا کر لیتے ہیں، جن پر کسی قسم کا قانون لاگو نہیں ہوتا۔ ان افراد کو خفیہ جیلوں میں لیجایا جاتا ہے جہاں سے بہت کم لوگ زندہ باہر آتے ہیں کہ اپنی کہانی سنا سکیں۔

اس ایذا رسانی کا مقصد کیا ہے؟ پہلی نظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کا مقصد معلومات حاصل کرنا ہو۔ لیکن اگر ہم ایذا کے طریقہ کار کا جائزہ لیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان ممالک میں ایذا رسانی کس طرح ریاست کے ایک نیم خفیہ ادارہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے تو پھر ہمارے لئے یہ باور کرنا مشکل ہوگا کہ اسکا مقصد محض معلومات حاصل کرنا یا اقرارِ جرم کرانا ہے۔ ہم کس طرح اس بات کا یقین کر سکتے ہیں کہ معلومات کے حصول کے لئے کسی حاملہ عورت کی چھاتیاں اور جنسی اعضا جلائے جا سکتے ہیں یا اس کی بچہ دانی پر بجلی کے جھٹکے دیئے جا سکتے ہیں۔ تاکہ بچہ ضائع ہو جائے یا بچہ کے دماغ میں چوٹ آ جائے۔ یا کان کے پردے میں تیز دھاری ٹکڑے ڈالے جا سکتے ہیں۔ پھر ان تشدد آمیز کارروائیوں کے ظالمانہ پہلو سے قطع نظر، یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مذکورہ طریقوں یا دواؤں کے استعمال کے ذریعہ کر لیا جانے والا اقرارِ جرم خود کتنا قابلِ اعتبار ہو سکتا ہے۔ دراصل اس سفاکی کا خاص مقصد فرد کی انسانیت کو ختم کرنا نظر آتا ہے جبکہ عمومی مقصد مخالفت کی روک تھام کی کوشش ہے تاکہ خوف کے ذریعے اقتدار کو جاری رکھا جا سکے۔

تعریف کی رو سے، ایذا رسانی میں کم از کم دو افراد کا ملوث ہونا ضروری ہے، ایک تو اذیت رساں جو اپنی نگرانی اور قبضے میں آنے والے فرد پر ایذا رسانی کے طریقے استعمال کرتا ہے تاکہ

اس کو ہر ممکنہ حد تک اطاعت پر مجبور کر سکے اور دوسرا وہ شخص جس کو اذیت دی جاتی ہے اور جو اس حالت میں ہوتا ہے کہ فوری طور پر تشدد کی مزاحمت سے بھی معذور ہوتا ہے۔ ذیل کے صفحوں میں ہم ایذا رسانی کے طریقوں، اذیت رساں اور اس کے عمل کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

ایذا رسانی کے طریقے

جب ایذا رسانی ریاستی پالیسی کا حصہ ہو تو پھر افراد کے مورال اور جسمانی سالمیت کو ختم کرنے کے بہت سے طریقے وجود میں آجاتے ہیں، فرد کو توڑنے کے لئے پرانے اور جدید دونوں طرح کے طریقوں اور تکنیک کا استعمال کیا جاتا ہے چاہے وہ جسمانی خرابی کے ذریعے ذہنی افعال کو ضرر پہنچانا ہو یا ذہنی دباؤ میں اضافہ کرنا ہو۔

ایذا کب اور کیسے دی جائے، یہ ایسی چیز ہے جو مقامی اور بین الاقوامی تجربات سے طے ہو چکی ہے کبھی کبھی اس کی مدد جدید طب اور ریسرچ کے نتائج سے بھی کی جاتی ہے جس میں ڈاکٹر بھی براہ راست شامل ہوتے ہیں۔ ایسی تصدیق شدہ رپورٹیں بھی موجود ہیں جن کی رو سے ایذا رسانی کے وقت ڈاکٹروں نے اس پورے عمل کی نگرانی کی اور ایذا رسانی کے طریقوں کو بھی جانچتے رہے۔ اس نگرانی کا مقصد یہ ہے کہ ایذا رسیدہ شخص بے ہوش نہ ہو اور نہ ہی تشدد کی سختی کی بنا پر موت کے منہ میں چلا جائے۔ ایسے ڈاکٹروں کا کام یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ایذا رسیدہ فرد پر زیادہ سے زیادہ ذہنی دباؤ ڈالا جائے اور اس سے مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جائیں۔

ایذا رسانی کے لیے سائنسی نکتہ نظر کو کئی لوگوں نے بڑی سنجیدگی سے لیا ہے۔ حال ہی میں "جرنل آف میڈیکل ایتھکس" میں ایک مضمون "ایذا رسانی کی اجازت پر" چھپا جس میں جی ای جونز نے ایذا رسانی کی حمایت میں دلائل دیئے ہیں۔ نظریہ ضرورت کی بنیاد پر اس کا دفاع کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

> "اس سے (ایذا رسانی) موت واقع نہیں ہونی چاہیئے اور جدید ترین دستیاب میڈیکل تیکنیک کو ضرور استعمال کرنا چاہیئے تاکہ غیر ضروری نفسیاتی یا جسمانی

نقصان نہ ہو صرف اتنی تکلیف دینے کی ضرورت ہے جس سے معلومات اخذ کی جا سکیں "

اور پھر مزید واضح بلیا ذہنیت کے ساتھ جب وہ ایذارسانی کی تناسب قیمت و منافع COST-BENEFIT RATIO پر بحث کرتا ہے (جس کا وہ شمسی توانائی سے مقابلہ کرتا ہے جو لمبی مدت میں فائدہ مند ثابت ہوتی ہے) اور جب وہ انسانی HUMANE ایذارسانی کہتا ہے ، وہ مزید لکھتا ہے۔

"ٹیکنالوجی اتنی اعلیٰ سطح پر ہے کہ ہم دماغ کے کچھ مرکزوں کو اس طرح چھیڑ سکتے ہیں کہ اس سے جو درد پیدا ہوگا اُس سے کوئی جسمانی خرابی یا برے جسمانی اثرات نہیں پیدا ہوں گے "

جونز ایذارسانی کے جس طریقے کی بات کرتا ہے اُس میں بظاہر بجلی کے جھٹکے یا مائیکرو سرجری سے دماغی مرکزوں کو چھیڑنا شامل ہیں ۔ وہ جان بوجھ کر یہ نظر انداز کر جاتا ہے کہ صرف اس کے نظر آنے والے نتائج ہی نہیں بلکہ ایذارسانی بذات خود ایک خوفناک تجربہ ہے۔ جونز جس بات پر پریشان ہے وہ ہیں عوام یا ایذارسانی کے مشاہداتی ثبوت ، نہ کہ اس بات سے کہ وہ کس چیز کی نمائندگی کرتی ہے اور نہ ہی اُسے ٹوٹی ہوئی خودی اور اذیت زدہ افراد پر مسلط کردہ نئے تعلقات کی پرواہ ہے ایذارسانی ایک ٹوٹ پھوٹ کا تجربہ ہے جو بچ نکلنے والے کے ساتھ ساری عمر رہتا ہے اور اُسے جسمانی یا انفعالی پہلوؤں سے زیادہ متاثر کرتا ہے جس کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے جونز کا یہ کہنا کہ "صرف اتنی تکلیف دی جائے کہ معلومات حاصل کی جا سکیں "، بہت بھولپن کی نشاندہی کرتا ہے، کیا کوئی اذیت رساں کبھی یہ بات ماننے کو تیار ہوگا کہ اُس نے اپنے زیر تشدد شخص پر اس کی برداشت سے زیادہ تشدد کیا؟

ایذارسانی کے مختلف طریقوں سے پیدا کی جانے والی تکلیف و دباؤ کی کیفیات مختلف النوع اور غیر متوقع ہوتی ہیں ۔ اس طرح سے اذیت زدہ کی یکساں انداز یا مختلف شخصی رویے اپنا کر تکلیف

کو بہتر طور پہ برداشت کرنے کی کوشش ناکام ہوجاتی ہے۔ لاطینی اور وسطی امریکہ کے چھ ممالک میں ایذارسانی کے طریقے اور تکنیک اکثر ایک جیسی ہی ہوتی ہیں یہاں تک کہ ایذارسانی کی اشکال کے نام بھی وہی ہیں۔ بین الاقوامی امداد باہمی" کی اس صورتحال کا اندازہ مندرجہ ذیل جدول سے ہوسکتا ہے۔

جدول نمبر ۱۔ ایذارسانی کے طریقے

۱۔ ماحولیاتی حربے:

سماجی محرومی (خاندان اور دوستوں سے علیحدگی)۔

تنہائی (رفاقت، جنس، کام، سکون اور کھانے میں کمی)۔

حسیاتی محرومی یا زیادتی (قید تنہائی، شور، انعکاسی شیشے وغیرہ)۔

نیند سے محرومی

۲۔ ادویات کے حربے:

خمار والی دوائیاں اور باربی چوریٹ کے انجکشن۔

ایل ایس ڈی یا ایسی ہی دوائیں۔

اپیو مارفین (مارفیا کا توڑ کرنے والی دوا)۔

سائیکلو فاسفے سائیڈ (جلا دینے والے کیمیکل)۔

پٹھوں کو اکڑا دینے والی دوائیاں۔

۳۔ جابرانہ حربے:

دوسرے لوگوں پر ایذارسانی کو مجبوراً دیکھنا یا سننا (دوست رشتہ دار، بیوی/شوہر، بچے)۔

جھوٹے الزامات۔

کبھی کبھار غیر معمولی طور پر انتہائی شفقت آمیز رویہ اختیار کرنا اور پھر دوبارہ تشدد

کا آغاز کر دینا۔

۴۔ جسمانی طریقے:

جبری طور پر کھڑے رکھنا، ایک مخصوص پوزیشن میں دیر تک اور عموماً بغیر کپڑوں کے کھڑے رکھنا، ٹھنڈا پانی ڈالنا یا اس میں ڈبو دینا۔

لوہے کی سلاخوں، ربر کے کوڑوں یا ڈنڈوں سے مارنا اور پیٹنا۔

فاقہ زدگی ۔ غذا اور پانی سے محرومی۔

قاطع اعضاء ۔ جسم کے مختلف حصوں کو علیحدہ کر دینا، ہڈیاں توڑ دینا۔

جنسی ایذا ۔ کپڑے پھاڑنا، جسم کو محسوس کرنا، آبروریزی کی کوشش۔

آبروریزی۔ ایذا رسیدہ فرد کی آبروریزی یا اسے ہم جنسی پر مجبور کرنا۔

بجلی ۔ آنکھوں، دانت، سر، جنسی اعضاء، مقعد پر بجلی کے جھٹکے لگانا، "الیکٹرک بستر" پر لٹانا۔

آگ ۔ مثلاً ویلڈنگ کرنے والی ٹارچ کو آنکھ، سر، جنسی اعضاء پر استعمال کرنا:

۵۔ نفسیاتی حربے:

بے عزتی کرنا۔ جھوٹے الزامات، گندی اور دھمکانے والی زبان، پھانسی کی دھمکیاں۔

نمائشی پھانسی۔

اذیت زدہ کے سامنے اُس کے خاندان یا دوستوں کو مار دینا۔

دوسرے لوگوں کی ایذا رسانی کی وڈیو یا آڈیو ٹیپ جس میں رشتہ داروں، بیوی/شوہر اور بچوں پر ایذا بھی شامل ہے ما اذیت زدہ کو سنوانا۔

اپنے دوستوں، بیوی/شوہر، رشتہ داروں کی آبروریزی ہوتے دیکھنا۔

نفسیاتی طریقوں کو جسمانی طریقوں سے صرف وضاحت کے لئے علیحدہ کیا گیا ہے۔ ایذا رسانی کی کسی بھی شکل میں نفسیاتی اور جسمانی دونوں اثرات شامل ہوتے ہیں۔

جدول نمبر ۲ - مخصوص طریقے

"آب وند"، یا "علاجِ زیر آب" - ایذا رسیدہ شخص کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا سر کسی حوض یا بالٹی میں جو فضلے، پیشاب اور پانی سے بھری ہوتی ہے۔

"کلاہ" بندے کے سر پر زبردستی ایک پلاسٹک کا تھیلا چڑھا دیا جاتا ہے جس میں اکثر کیڑے مار دوائی ہوتی ہے یہاں تک کہ اُس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔

"ٹیلی فون" پیچھے سے دونوں کانوں پر ایک ساتھ پٹائی کرنا۔

"طوطے کا شاخ پر بیٹھنا" ایذا رسیدہ شخص کی کلائیاں اور ٹخنے ایک ساتھ باندھ دیئے جاتے ہیں اور پھر جسم کو گھٹنوں کے نیچے ایک لوہے کے تار کے ذریعے لٹکا دیا جاتا ہے جس سے سارا جسم اوندھا اور ناقابلِ مدافعت ہو جاتا ہے۔ اس پوزیشن میں بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے ہیں اور گندہ پانی منہ میں ٹھونسا جاتا ہے۔

"کتے کا گھنٹہ" زیر تشدد شخص کو زمین سے کچھ فٹ اوپر بازوؤں کے ذریعے لٹکا دیا جاتا ہے جو کمر کے پیچھے بندھے ہوتے ہیں۔

"کانٹا یا لٹکانا" زیر تشدد فرد کو کمر کے گرد ایک رسے سے باندھ کر لٹکا دیا جاتا ہے، جب کہ اُس کے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوتے ہیں۔

"مٹریون کی صدری"[۱] ایسی صدری کو آہستہ آہستہ پھلایا جاتا ہے یہاں تک زیر تشدد شخص کی سینے کی ہڈیاں ٹوٹنے لگتی ہیں اور سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔

"پی کا ڈائی" ایک لمبی سوئی کو عموماً ایذا رسیدہ شخص کے ناخنوں کے نیچے گھسا دیا جاتا ہے

۱؎ ڈان مٹریون کے نام پر رکھا گیا جو شمالی امریکی AID کا آفیسر تھا، جس پر الزام تھا کہ وہ یوروگوائے کی پولیس کو رد بغاوت تکنیکوں بشمول ایذا رسانی پر مشورے دیتا ہے۔

ایذارسانی کے اثرات

کتنی انسانیت
اب درد، دہشت اور خوف میں ہے۔
ہم چھ تھے
جو خلاء میں ستاروں میں کھو گئے۔
ایک مر گیا، ایک کو اتنا مارا گیا کہ مجھے یقین نہیں آتا ہے
کہ انسان کو اتنا مارا پیٹا جا سکتا ہے۔
باقی چار تمام خوفوں سے بھاگنا چاہتے ہیں۔
ایک خلاء میں چھلانگیں لگاتا ہے
اور باقی دیواروں سے اپنا سر پھوڑتے ہیں۔
سب کی نظروں میں موت منجمد ہے۔
فوج اپنا کام بہت تیکھے پن سے کرتی ہے۔
خون اُن کے لئے تمغہ ہے
اور قتل عام، مردانگی و بہادری کا نشان

وکٹر جارا کا نغمہ ۱۹۷۳ء

یہ چلی کے گلوکار کے آخری نغمے کا کچھ حصّہ ہے، جسے چلی کے اسٹیڈیم میں ۱۹۷۳ء کی فوجی کایا پلٹ کے بعد فوجیوں نے اُسے گانے پر مجبور کیا گیا۔ جب وہ گا رہا تھا تو اس کی انگلیوں کو توڑا گیا اور اُسے بار بار مارا گیا یہاں تک کہ اُس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اُس کے جنسی اعضاء پس کر رہ گئے، کئی دنوں کے بعد اُس کی لاش سنتیاگو کے سڑک پر پڑی ملی۔

اذیت زدہ کے لیے ایذارسانی وجود کی بیمانہ تباہی کی علامت ہوتی ہے جو یقیناً بچ نکلنے والے اور اُس کے سماجی حلقے میں دائمی نشان چھوڑ جاتی ہے۔ خوف، شرمندگی، بے عزتی کا خیال اور جسمانی اذیت کیسے اور کس حد تک اذیت زدہ پر اپنا نشان چھوڑیں گی، ایسی بات ہے جسے عمومی انداز میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ اذیت کا شکار ہونے والے کی شخصیت کی ساختی خصوصیات بہت اہم ہیں: اذیت زدہ کا اپنا واضح پن اور حوصلے کی مضبوطی، مقصد کا ادراک کومٹ منٹ اور نظام کے خلاف نفرت بھی جو تکلیف کا باعث بنتی ہے۔ لیکن ایسے شخص پر ایذارسانی کے اثرات اس بات پر بھی منحصر ہوتے ہیں کہ اُس پر کتنا دباؤ ڈالا گیا ہے یعنی اس کی شدت اور دورانیہ کیا تھا۔

تکلیف کا اندازہ صرف جسمانی نقص، کمی یا خرابی سے نہیں کیا جانا چاہیئے بلکہ یہ بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس تجربے کی جذباتی اہمیت کیا ہے جس سے تشدد کا نشانہ بننے والے کی باقی ماندہ زندگی میں بڑی تبدیلی آجاتی ہے۔ ایذارسانی سے گھبراہٹ و بے چینی، سوچنے میں مشکل، اپنی نظر میں گرنا، سماجی میل جول میں کمی، پیداواری صلاحیت میں کمی اور مقاصد سے دستبرداری پیدا ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو مزاحمت نہیں کر پاتے اور ٹوٹ جاتے ہیں، مزید خطاواری اور مایوسی اُن کا انتظار کرتی ہے۔

امراض نفسیات کے نکتہ نظر سے ایذارسانی شدید دباؤ کی صورتحال کو پیش کرتی ہے جو واضح طور پر گھبراہٹ و بے چینی کو جنم دیتی ہے جو صرف درد اور شرم و ذلت سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ اُس میں بے یقینی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایذارسانی کے زیر اثر فنا ہو جانے کا خطرہ سر پر منڈلاتے ممکنہ امکان سے زیادہ ہوتا ہے، بلکہ شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اذیت زدہ کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کیسے اور کیا اور کب واقعی فنا کرنے کا عمل مکمل ہوگا۔ امراض نفسیات کی زبان میں، ایذارسانی کے بعد از اثرات کی علامتوں بشمول غیر معمولی نوعیت اور عمومی انسانی تجربے سے باہر کے نفسیاتی حادثاتی واقعات کو بعد از حادثاتی دباؤ کے عوارض کا نام

دیا جاتا ہے۔ مختصراً یہ عوارض ایک ایسی صورتحال کو پیش کرتے ہیں جس سے خودی میں تحریف اور انتشار پیدا ہوتا ہے اور اس طرح فوری یا پرانی علامات کا مجموعہ بنتا ہے جس کی خصوصیات یہ ہوتی ہیں ۱۔ حادثاتی واقعہ کی بے جا تکرار اور خوفناک خواب جس میں واقعہ دوبارہ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ ۲۔ تحلیلی حالت ؛ DISSOCIATIVE STATE جو منٹوں سے دنوں پر محیط ہو سکتی ہے جس میں وہ شخص ایسے برتاؤ کرتا ہے جیسے حادثہ رونما ہو رہا ہو، یہ ایسے وقت ہوتا ہے جب ماحول میں یا کسی خیالی محرک نے پرانے واقعہ سے کوئی نسبت جوڑ دی ہو۔ ۳۔ جذبات میں کھنچاؤ، گرد و پیش کے حالات پر ردعمل میں کمی اور دوسروں سے بیگانہ محسوس کرنا۔ ۴۔ غیر ضروری چوکناپن، حد سے بڑھا ہوا بدحواسی ردعمل، بے چین نیند، کمزور یادداشت وغیرہ۔ پھر بھی جیسا کہ مشاہدہ کیا گیا ہے، انسان کی پیدا کردہ تباہی سے مثلاً ایذارسانی سے پیدا کردہ علامات دوسرے دباؤ کے مقابلے میں شدید اور نتائج کے اعتبار سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں اور قبل از موت کو جنم دے سکتی ہے۔

اگرچہ سارے محقق اس بات پر متفق نہیں ہیں، لیکن کچھ تحقیقات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایذارسانی سے پیدا ہونے والے نفسیاتی اثرات کو بذات خود ایذارسانی علامتی مجموعہ TORTURE SYNDROME ؛ کہا جا سکتا ہے۔ ایذارسانی کے نتیجے میں انسانی جسم اور ذہن پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں ہمارا علم بڑی حد تک محدود ہے کیونکہ تشدد کے نتیجے میں ہونے والی نفسیاتی اور جسمانی تبدیلیوں کے بارے میں ابھی بہت کچھ تفصیلات واضح نہیں ہوئی ہیں۔ ایذارسانی کے طویل المدت اثرات پر تحقیقات بھی تقریباً ناپید ہیں۔ اگرچہ ڈنمارک کے ایک حالیہ مطالعہ نے جو ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ایما پر کیا گیا تھا کچھ خیالات ابھارے ہیں۔ اس مطالعہ میں ۱۲۵ اذیت زدہ افراد کا طبی اور ذہنی معائنہ کیا گیا۔ تحقیق کے مطابق معائنہ کے وقت جو ایذارسانی کے چھ ماہ سے ایک سال کے بعد کیا گیا، ۹۰ فیصد افراد نے مختلف علامتوں کا اظہار کیا ہے جو ایذارسانی کے ساتھ یا بعد میں شروع ہوئیں۔ ان میں ۷۵ فیصد نے

نفسیاتی امراض کی علامات پیش کی ہیں جن میں کمزور یادداشت، توجہ مرکوز کرنے میں خلل، ذہنی تبدیلیاں، نیند اور جنسی افعال میں خرابی شامل ہیں۔ تمام افراد گرفتاری سے پہلے بالکل ٹھیک تھے۔ دوسری طرف آلوڈی اور کاؤگل نے ایذارسانی کے اہم معاملات کی تفتیش کی اس تفتیش کا محور اُن ہزاروں پناہ گیزینوں میں سے منتخب افراد کو بنایا گیا ہے جو ایک مخصوص لاطینی امریکی ملک سے تعلق رکھتے تھے اور جنہوں نے کینیڈا میں سکونت اختیار کی تھی تحقیق میں ایذارسانی کے شکار ۳۲ مرد اور ۹ عورتیں تھیں جن کی عمریں دس سال سے کم سے لیکر ۴۶ سال تک تھیں اوسط عمر ۲۶.۹ سال۔ اُن میں سے ۲۵ فیصد کی یونیورسٹی ٹریننگ تھی ماسوائے دو عورتوں کے جنہوں نے کل ۱۱۲ مرتبہ جیل کاٹی تھی جو مہینوں سے سالوں پر محیط تھی (ایک شخص پانچ سالوں میں ۱۱ مرتبہ قید ہوا تھا) ان تمام افراد کو جسمانی اور ذہنی ایذارسانی سے گزرنا پڑا۔ آلوڈی اور کاؤگل نے نتیجہ اخذ کیا کہ وہ سب ایک ہی جیسے نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھے جس کی علامتیں شدید گھبراہٹ و بےچینی، نیند میں کمی، جبر سے متعلق خواب یا اُن کا اپنا ایذارسانی کا تجربہ، جسمانی علامات، بےجا خوف شک اور ڈر ہیں۔ اپنے تجزیے میں انہوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ شخصی نظریاتی تیاری، لگاؤ اور گروپ کا سہارا ایذارسانی سے نفسیاتی صحت یابی کے لئے مثبت نسبتی تعلق رکھتے ہیں۔

بعض اوقات باقی ماندہ علامتیں SEQUAE عضو یا افعال میں ایسی خرابی پیدا کرسکتی ہیں جو ایذارسانی کا براہ راست نتیجہ نہیں ہوتی۔ مثلاً لنڈی، روسموسو اور دوسروں نے ایذارسانی کے شکار ۱۷ مردوں کے جنسی افعال کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ سر یا جنسی اعضاء پر چوٹ یا ایذارسانی کی شدت سے آزاد ۱۹ فیصد لوگوں نے جنسی افعال میں گڑبڑ کی شکایت کی جو خواہش میں کمی یا خیزش میں خلل پر مشتمل تھی جبکہ دماغی یا جنسی کسی ہارمون میں کوئی کمی نہ تھی۔ ایک اور مطالعے میں جنسن، جلینفکی اور دوسروں نے پانچ افراد میں جن کی عمریں چوبیس سے انتیس سال کے درمیان تھیں اور جو شرابی نہ تھے اور پہلے بالکل صحت مند تھے، دماغ کی اوپری جھلی یا مرکزی

حصے میں ناکارہ پن CORTICAL OR CENTRAL CEREBRAL ATROPHY کو کمپیوٹیرائزڈ ایکزیئل ٹوموگرافی COMPUTERISED AXIAL TOMOGRAPHY کے ذریعے دیکھا۔ یہ افراد شدید اور لمبے عرصے تک (اوسطاً چار سال) ایذارسانی کا شکار رہے تھے ان سب میں توجہ مرکوز کرنے میں کمی، سر میں درد، گھبراہٹ، اداسی، کمزوری، نیند کی گڑبڑ، ذہنی تھکن آنکھوں میں درد اور کمزوری اور جنسی افعال میں گڑبڑ کی علامتیں کئی سال تک موجود رہیں۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ ناکارہ پن کی تبدیلیاں سر پر چوٹ کی وجہ سے نہیں ہوئیں، ایک ممکنہ طریقہ کار جس سے یہ علامتیں ہو سکتی ہیں وہ ہے شدید اور طویل المدت ایذارسانی کے نتیجے میں کورٹی سول CORTISOL ہارمون کی زیادتی۔

ایذیت رساں

"ہم نے اُن تمام (سیاسی قیدیوں) کو قتل کرنے کی جسارت نہ کی جب کہ ہم یہ کر سکتے تھے اور ایک دن تو ہمیں انہیں چھوڑنا ہی پڑے گا۔ لیکن ہمیں اس دستیاب وقت کا فائدہ اٹھانا ہے تاکہ انہیں پاگل بنا سکیں۔"

میجر آرگومیڈس میچل

ڈائریکٹر آف لیبرٹاڈ جیل، یوروگوائے،

جب ایسے انسانی رویے سے سابقہ پیش آئے خصوصاً جب کہ وہ بہت منفی خصوصیت کا حامل ہو تو ماہرینِ نفسیات اور اس میدان سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگ اس کی جڑیں بنیادی طور سے فرد میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں یا بہت ہوا تو اُس کے آس پاس کے ماحول میں۔ اس تنگ نکتہ نظر سے اذیت رساں کے رویے کو بڑی آسانی سے اذیت پسند، معاشرت دشمن SADISTIC SOCIOPATH کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو والدین کی ناقص تربیت، اپنی جذباتی محرومی پر ناراضگی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے یا مزید تخفیفی REDUCTIONIST حوالے سے جنسیاتی GENETIC کمی یا دماغ میں کچھ کیمیائی توازن میں گڑبڑ کی وجہ

سے ہوتا ہے اس اندرونِ نظام فہم INTRASYSTEMATIC ORIENTATION کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ سببیت یا علیت CASUALITY کو کسی ایک یا کچھ مخصوص عناصر سے جوڑتی ہے جبکہ معاشرتی و معاشی حالات کو یا تو بالکل خاطر میں نہیں لاتی یا انہیں صرف کثیر الوجوہات سببیت MULTIDETERMINED CASUALITY میں عناصر کا مجموعہ AGGREGATE FACTORS قرار دیتی ہے۔ معاشرتی و معاشی نظام اور اُس سے بننے والا کلچر ایک بنیادی عنصر ہے جو تاریخ کو بناتا (اور اس سے بنتا بھی) ہے، جو ترجیحات طے کرتا ہے اور ماحول میں تبدیلیاں لاتا ہے۔

جارحیت AGGRESSION کا ماخذ فرد یا اُس کے قریبی خاندان میں تلاش کرنے کا نظریہ دراصل مسئلہ کے تنقیدی جائزے سے پہلو تہی کرتا ہے یہ نظریہ ان معاشروں کی تاریخ کو نظر انداز کرتا ہے جہاں جارحانہ رویوں کو پسندیدہ تصور کیا جاتا ہے، جنگی ہیروں کی مدح ہوتی ہے اور جہاں تباہی و بربادی کی قوتوں کی موجودگی کو امن کی ضمانت قرار دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس شخص کا ہم مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اُس کے لئے ہمیں فرد اور اُس کے قریبی خاندان سے باہر بھی جانا ہوگا اور اُن حالات کا جائزہ لینا ہوگا جو معاشرے میں عمومی طور پر پائے جاتے ہیں اور جنکو تشدد آمیز کارروائیوں سے تقویت حاصل ہوتی ہے سیاسی اذیت رساں دراصل معاشرے، فوج اور قوم کے فائدے کے نام ہی پر تشدد کرتا ہے، وہ کوئی اکیلا مجرم نہیں ہے جیسا کہ ہمارا ضمیر یقین کرنا چاہتا ہے، وہ ایک منظم گروپ کا ممبر ہے جو نیم خود مختارانہ طور پر عمل کرتا ہے لیکن حکومت کی مختلف شاخوں کی رہنمائی میں وہ ایک بڑے جال کا حصہ ہے جو طاقت کو قائم رکھنے اور تسلط کو جاری رکھنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر کوئی اذیت رساں بن سکتا ہے؟ جواب بدھا سادا نہیں ہے۔ شاید مندرجہ ذیل کلاسیکی تجربہ اس گومگو کی کیفیت کو بہتر طور پر بیان کر سکے۔ چند سال پہلے ایس میلگرم نے ییل YALE یونیورسٹی کی تجربہ گاہ میں "تابعداری کا کرداری مطالعہ" BEHAVIORAL STUDY OF OBEDIENCY کے نام سے ایک تجربہ کیا۔ تجربے میں بہ رضا کار شامل تھے جنہیں یقین دلایا گیا کہ وہ ایک ایسے تجرباتی مطالعے میں حصہ لے

رہے ہیں جو یادداشت اور سیکھنے کے عمل (LEARNING) سے متعلق ہے۔ ہر رضاکار کو کہا گیا کہ وہ سیکھنے والے کے غلط جواب پر اُسے بجلی کا جھٹکا دے۔ اگرچہ کسی کو حقیقی کرنٹ نہیں دیا گیا لیکن انھیں کہا گیا کہ وہ ایسا ظاہر کریں کہ انھیں جھٹکا لگا ہے۔ تجربہ اس طرح سے بنایا گیا تھا۔ سزا کا کرنٹ ایک خاص وولٹیج تک پہنچ جاتے تو استاد رضاکار اور طالب علم رضاکار اس طریقے کو ختم کرسکتے ہیں۔ لیکن زبانی طور سے اس بات پر بہت بڑھا جاتی اور بعض اوقات سختی سے حکم دیا جاتا کہ اگر طالب العلم رضاکار اپنا کام صحیح نہ کرے تو زیادہ وولٹیج کے جھٹکے دیئے جائیں۔ ہر رضاکار میں کسی نے بھی تجربے کو اُس وقت تک نہ روکا جب تک کہ کرنٹ کی سطح ۳۰۰ وولٹیج تک نہ پہنچ گئی جس پر طالب علم رضاکار دیواروں پر پیر مارنے لگتے تھے اور کثیر الجواب سوالات کے جواب بالکل نہ دے پاتے۔ تجربے کے آخر تک ۴۰ میں سے ۲۶ رضا ۴۵۰ وولٹ کی حد تک پہنچ چکے تھے۔

یہ تجربہ ہمیں انسانی امکانات کے بارے میں بتاتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کس طرح متغیرات (VARIABLE) کی تبدیلی سے اپنی خواہشات کے برخلاف کام کرتا چلا جاتا ہے۔ یقیناً تجربے کے بہت سے پہلو ہیں جن پر سوال کئے جاسکتے ہیں مثلاً حقیقی اذیت زدہ کون تھے؟ یہ بات بھی نظر انداز نہیں کیجا سکتی کہ یہ تجربہ امریکہ کی ایک نامور اور شہرت یافتہ یونیورسٹی میں سائنس کے نام پر کیا گیا۔ اس تجربے کے ماحول کے بارے میں ایک اوسط آدمی شاید ہی یہ سوچ سکے کہ یہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔ اس تجربے میں حصّہ لینے والے بہت سے کردار اپنے ساتھیوں کو درد اور دباؤ کے باوجود جھٹکے دیتے رہے اور اپنے تضادات سے لڑتے ہوئے سائنس دانوں کی سفارشات کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس تجربے سے یہ نکتہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انفرادی اذیت رساں کو ایک خاص نفسیاتی فتور (PSYCHO PATHOLOGY) کا نام دے دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس قسم کی مشق کو اگر جاری نہ رکھا جائے تو وہ خود بخود ختم ہو جاتی ہے الا یہ کہ تشدد کرنے پر فائز شخص خود بھی کوئی سماج دشمن اور مجرم ہو۔

اذیت دینے والا اذیت رسانی کو پیشہ کے طور پر کیونکر اختیار کر لیتا ہے۔ پہلی بات تو یہ

اس کے پس منظر میں ایسے معاشرتی اور مادی حالات کا ہونا لازمی ہے جو اس بدمعاشی کے کام کو آسانی سے سہار سکیں۔ دوسرے اُس کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے تاکہ وہ کام کو بہتری اور عزم کے ساتھ کر سکے۔ یہ تعلیم اذیت رسانی کے اسکولوں اور بعض اوقات غیر ملکی ماہرین کے ذریعے دی جاتی ہے۔ جس کا مطلب نہ صرف اذیت کی تیکنیک سے آگاہ کرنا ہوتا ہے بلکہ اُسے نفسیاتی اور نظریاتی طور پر اس کام کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے۔ یہ ذہنی تیاری کیسے حاصل کی جاتی ہے؟ سب سے پہلے تشدد کا ہدف بننے والے شخص یا گروپ کو غیر انسانی باور کرایا جاتا ہے۔ اس تربیت میں اذیت زدہ کو ایک شے کے طور پر دیکھنا ضروری ہوتا ہے، جو کہ ریاست اسماجی طبقے جس کی وہ خدمت کرتا ہے، کا مخالف ہے اور سماج کے لئے اُسے سزا دینا ضروری ہے۔ اس ضمن میں دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اذیت دینے کے کام پر فائز افراد کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں یا اُن سے جو کچھ کروایا جا رہا ہے وہ ملک اور قوم کے فائدے میں ہے۔ اس طرح اُن کے بدترین افعال بھی، اخلاقی اصولوں کی شدید خلاف ورزی نہیں کرتے۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ ان کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ انہیں ہر صورت میں اپنی تنظیم کے ساتھ وفادار رہنا چاہیئے اور اس کے رازوں کو خفیہ رکھنا چاہیئے۔ انہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ خود ان کی حفاظت کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ اور یہ کہ ان کی کارروائیاں ہمیشہ خفیہ رہیں گی۔ اس یقین دہانی کے نتیجے میں انفرادی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے البتہ انفرادی خواہش کو تنظیم کے تابع کرنا پڑتا ہے۔

تربیت کے ضمن میں چوتھا اہم پہلو یہ ہے کہ انسٹرکٹر پراسراریت کی فضاء کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ طویل المدت لگاؤ اور گروپ کی جذبندی میں مدد ملے۔ اذیت رساں کو اکثر اوقات جھوٹے ناموں سے پکارا جاتا ہے جس سے اُس کی شخصی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے اور چند کو باقاعدہ ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔

اس تربیت کے باوجود، یہ ممکن ہے کہ اذیت رساں اپنے عمل کی وجہ سے دباؤ کا شکار

ہو اور یہ محسوس کرے کہ وہ بھی استحصال کا نشانہ ہے وہ عموماً کم درجے کا عہدیدار ہوتا ہے جو کہ اُس سماجی طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس کا وہ خود استحصال کرتے ہیں جن کی وہ خدمت انجام دیتا ہے اور نتائج کے فوائد بھی حقیقتاً اُس کے لئے نہیں ہوتے۔ یہ صورتحال اُسے شدید تضاد کا شکار بنا دیتی ہے جو اُس کے عمل میں بھی منعکس ہوتا ہے، اور اس سے تقاضہ کرتا ہے کہ ذاتی سطح پر اُس کو سلجھائے۔

فسٹنگر کے مطابق اگر کوئی شخص خیالات کے دو ایسے مجموعے رکھتا ہے جو نفسیاتی طور پر ایک دوسرے سے مطابقت نہ رکھتے ہوں تو وہ اس عدم مطابقت کی وجہ سے تکلیف کا شکار ہوگا۔ اس تنازع کو ختم کرنے کے لئے وہ شخص یا تو کسی ایک خیال کو چھوڑے گا یا ایک تیسرا خیال اختیار کرے گا تاکہ عدم مطابقت کو کم کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں وہ کسی ایسے نتیجے پر پہنچے گا جو اُسے مطمئن کر سکے کہ کسی ایک خیال پر کام کرنے کا فائدہ ہے خصوصاً اگر خیالات عمل کی شکل میں تبدیل ہو چکے ہوں۔ یہاں اہم بات یہ ہے کہ عدم مطابقت کا ... ہمیشہ ذات کو شامل کرتا ہے اور پیدا کردہ غیر مطابقت کو کم کرنے کے لئے اپنے آپ کا صحیح ثابت کرنے کی رہت ہے۔

اگر ہم اس بات کو، اذیت رساں کو درپیش صورتحال پر منطبق کر سکیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ ایک المیہ کا شکار ہے۔ اُسے استدلال کی نفی کرنے کی، اور اپنے عمل کے پرچھائیں سے محفوظ رہنے کی ضرورت ہے۔ اُسے کچھ فوائد (داخلی) حاصل کرنے کی ضرورت ہے ورنہ اپنے عمل کی نوعیت کی وجہ سے وہ ناقابلِ برداشت دباؤ کے شکار ہونے کے خطرے سے دوچار ہوتا ہے، جو کہ اُس کے نفس (PSYCHE) کو توڑ کر اُسے تباہ کر سکتا ہے (اذیت کے شکار اور انسانی حقوق کی ایجنسیوں کے ثبوت ظاہر کرتے ہیں کہ اذیت رساں اپنے شکار کو شراب یا دواؤں کے زیر اثر تکلیف پہنچاتے ہیں۔ جن مطبوعات کا مطالعہ کیا گیا اُن میں اذیت رساں سے براہِ راست انٹرویو یا "مطالعہ" شامل نہ تھے لیکن اُس کے عمل کی نوعیت اور اذیت کے شکار افراد کے بیانات کی روشنی میں یہ نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں کہ اذیت رساں کو اپنے ردِعمل میں مدد

دینے والے کون سے نفسیاتی طریقے درکار ہوں گے ؟ پہلے اذیت رساں کو، جو اپنے عمل سے آنکھیں نہیں چرا سکتا، حقیقت کو بگاڑنے اور ایسی تدبیروں کی ضرورت ہوتی ہے جس سے وہ اپنے عمل اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کو چھپا سکے ۔ یہاں بنیادی طریقہ کار تظلیل "PROJECTION" کا ہے ۔ اذیت زدہ کو اپنی تکلیف کا خود ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے "تمہیں وہی کچھ مل رہا ہے جو تم چاہتے تھے" لیکن الزام کا تبادلہ شاید کافی نہیں، کیونکہ اذیت رساں جانتا ہے کہ وہ خود شکاری ہے اس لیے کچھ اور چیز کی ضرورت ہے ۔ اذیت رساں کو اذیت زدہ سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھنے کی ضرورت ہے وہ اپنے آپ کو اس سے فاصلے پر رکھتا ہے اس کے لیے وہ اذیت زدہ کو کم تر حیثیت میں شمار کرتا ہے (بعض اوقات اسے یہ سکھایا جاتا ہے) جو ایک گہری سطح پر اپنے عمل اور اپنے اساسی کفیل کی تظلیلی "PROJECTED" نفرت ہوتی ہے جسے وہ اذیت زدہ کے اندر ختم کرنا چاہتا ہے ۔ یہاں بحث یہ نہیں ہے کہ اذیت رساں ہی اذیت زدہ ہوتا ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسئلہ جدلیاتی ہے ۔ اذیت رساں شکاری ہے لیکن اس کے اندر ایک شکار بھی ہے جس کی وہ نفی کرتا ہے یعنی اپنی اذیت زدگی کی حالت کو باہر نکال کر اذیت زدہ پر ڈالتا ہے اور اسے ختم کر دینا چاہتا ہے ۔ اس طرح اذیت دیتے ہوئے وہ اپنے شکار پر تین کامیابیاں حاصل کرتا ہے ۔ ایک وہ فتح جو دوسروں کو اذیت دیتے ہوئے اپنی اذیت زدگی "VICTIMISATION" کے جذبات کو تباہ کرنے پر حاصل ہوتی ہے ، دوسری فتح اذیت زدہ کے اندر موجود اپنی منتقل نفرت سے انتقام لے کر ہوتی ہے جو اسے ان لوگوں سے ہوتی ہے جن کے لیے وہ کام کرتا ہے اور جو اس کی بدمعاشی کی حرکتوں کے حقیقی فائدہ اٹھانے والے ہوتے ہیں لیکن ایک اور سطح پر، شکار کو اذیت دیتے ہوئے اذیت رساں اپنے جوابی انتقام اور موت کے خوف پر، دوسروں کی زندگیوں پر مطلق کنٹرول حاصل کر کے قابو پاتا ہے ۔

اختتامیہ

کچھ جاننا اور عمل نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کچھ نہ جانا جائے۔

ایک پرانی جاپانی کہاوت

ساری دنیا میں اذیت روزمرہ زندگی کے تجربے کا حصہ ہے جسے ہزاروں لوگ برداشت کرتے ہیں۔ اذیت، کو قومیں ساختی آلے کے طور پر استعمال کرتی ہیں تاکہ تعلقات کے معین نظام کو بنایا اور جاری رکھا جاسکے۔ لاطینی امریکہ کے ممالک جنکی حکومتیں نہ صرف اپنے آپ کو جمہوری کہتی ہیں بلکہ بعض دوسرے ممالک بھی انہیں جمہوری کہتے ہیں، اس کی خام اور امتیازی مثالیں ہیں۔

یہاں ہم نے اذیت کی خاص قسم کے کچھ پہلو، اس کے مشہور قلیل و طویل المدت اثرات اور اس کے مقاصد بیان کیے ہیں اور چند نفسیاتی محرکات کو واضح کیا ہے، جس کے تحت شاید اذیت رساں کام کرتا ہے یقیناً یہ وضاحتیں سب کچھ نہیں بتا دیتیں اور نہ ہی اُس شخص کو معافی کا حق دار ٹھہراتی ہیں جو بذات خود اذیت دیتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان افراد کو اُس تاریخی اور سماجی سیاق و سباق میں دیکھا جائے جس میں وہ عمل کرتے ہیں، یہ نہ بھولتے ہوئے کہ پیسہ کون دیتا ہے، کون حمایت کرتا ہے اور کس کو فائدہ پہنچتا ہے۔ خوش قسمتی سے ساری دنیا میں ایسی ایجنسیاں اور تنظیمیں ہیں جو انسانی حقوق پر جوکسی سے نظر رکھتی ہیں اور جنہوں نے بڑی بہادری سے اذیت کی مذمت کی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ جن کے پاس طاقت ہے کہ وہ تشدد پر کمربستہ حکومتوں پر موثر دباؤ ڈال سکیں، وہ صرف زبانی تنقید کو کافی سمجھتی ہیں یا پھر اس ساری صورتحال کو ناقابلِ اعتنا سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیتی ہیں۔

آخر میں ہم مختصراً ریاستی اذیت کی ایک اور قسم کا ذکر کریں گے، جس پہ ہمیں سوچ بچار کرنا چاہیئے لیکن جو اپنی نوعیت اور نتائج کے اعتبار سے ایک علیحدہ مطالعہ

چاہتی ہے ، ہمارا اشارہ اُس دیدہ دانستہ ، تربیت ساز اور "خوراکی" ! DOSED
نفسیاتی اور طبعی تشدد کی طرف ہے جو ایک ملک اپنی معاشی اور فوجی طاقت کیوجہ
سے چھوٹی قوموں اور اُس کے عوام پر کرتا ہے ۔

یہ چھوٹے ممالک اپنے حالات کی وجہ سے اس صلاحیت سے محروم ہیں کہ
اپنے اوپر ہونے والے مذکورہ تشدد کو روک سکیں یا اُس کا ترکی بہ ترکی جواب
دے سکیں ۔

(ترجمہ : سید انور)

* * *

سائنس کے میدان میں پاکستان کی پسماندگی

سماجی و نظریاتی اسباب

پرویز ہودبھائی

تمہید

پاکستان میں سائنس کی تعلیم و تحقیق کی بدحالی ہر سچے حب الوطن پاکستانی کو انتہائی مایوس کن اور تشویشناک نظر آتی ہے۔ سائنسی پسماندگی کا مشاہدہ ہم ہر سمت اور ہر سطح پر کرتے ہیں۔ ملک کے مختلف سائنسی تحقیق کے ادارے، مثلاً COE PAEC PCSIR وغیرہ زیادہ تر بیوروکریسی کے دفاتر کا کام ہی سرانجام دیتے ہیں۔ PCSIR کے چیرمین نے حال میں اعتراف کیا کہ ان کا ادارہ جو کئی ہزار افراد پر مشتمل ہے اور جس پر کروڑوں روپے خرچ ہوئے ہیں، ناکام رہا ہے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ ہم PCSIR کی سالانہ نمائش سے کرتے ہیں، جو کسی ہائی اسکول کے طلبہ کی کاوش معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان میں اس قسم کے تحقیقی اداروں کی تعداد بڑھتے بڑھتے اب ایک سو کے قریب پہنچ گئی ہے مگر ان سب کی سائنسی یا ٹیکنیکی پیداوار امریکہ کی صرف ایک ریسرچ لیبارٹری سے بھی کم ہے۔ یہ ایک سبب ہے کہ ہم ہر قسم کی مشینیں، آلات اور چھوٹی و بڑی سائنسی اشیاء درآمد کرنے پر مجبور رہیں۔ سائنسی لٹریچر کی پیداوار کے اعتبار سے ہندوستان کا درجہ دنیا میں ساتواں ہے جبکہ تمام اسلامی ممالک، بشمول پاکستان، ساٹھویں درجے سے بھی نیچے ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام بتاتے ہیں کہ ان کے شعبہ یعنی فزکس میں صورتحال مایوس کن ہے۔ انہوں نے اس امر کی نشاندھی کی ہے کہ پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں میں فزکس کے Ph.D'S کی کل تعداد امپیریل کالج لندن کے Ph.D'S کی تعداد سے بھی کم ہے۔ یہ صرف تعداد کی بات تھی، اگر معیار اور قابلیت کا حساب شامل کیا جائے

تو پلّہ اور بھی زیادہ جھک جاتے۔

ملک میں معیاری اور مفید سائنسی تحقیقات کا فقدان یقیناً افسوس کا باعث ہے۔ آخر، زمانۂ جدید میں ملکی حیثیت کی کونسی چیز ہے جس کا دار و مدار سائنس و ٹیکنالوجی پر نہ ہو؟ لیکن پاکستان میں سائنس کی تعلیم کی موجودہ کیفیت ملک میں سائنسی تحقیق کی ناکامی سے بھی زیادہ تشویشناک ہے کیونکہ سائنسی ترقی کا مستقبل اسی تعلیم پر منحصر ہے۔ میں شعبہ تعلیم کی بدحالی کی بابت کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ ہمارے وزیر تعلیم خود اعتراف کرتے ہیں کہ پاکستان کا تعلیمی نظام مفلوج ہو گیا ہے۔ یہ بات یقیناً درست ہے چنانچہ ہماری سائنسی مشکلات فقط عارضی نہیں بلکہ عرصہ دراز تک ملک کا سائنسی مستقبل تاریکی میں گھرا رہے گا۔

سائنس کی موجودہ کیفیت کے کئی تجزیے سننے میں آتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ سائنس پر روپیہ کم خرچ ہوتا ہے اور تجویز کرتے ہیں کہ اقوام متحدہ کی تجاویز پر عمل کرتے ہوئے اس شعبہ میں اخراجات پانچ گنا بڑھا کر (کل قومی پیداوار) کے ایک فیصد کے برابر کیے جائیں۔ پھر ایک عظیم ترین یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی تعمیر زیر غور ہے۔ اس کے علاوہ ایک یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اگر انگریزی کو خارج کر کے اردو رائج کی جائے تو سائنسی مضامین آسان فہم ہو جائیں گے۔ یہ تمام تجاویز نہ غلط ہیں نہ صحیح۔ مگر ان میں اس مرض کا کہیں ذکر نہیں جو ہمارے سائنسی انحطاط کا اہم ترین سبب ہے۔ جس طرح سرطان کا علاج اسپرو سے ممکن نہیں ویسے ہی ان تجاویز سے زیادہ امید وابستہ کرنا بے سود ہو گا۔ چنانچہ ہم پر لازم ہے کہ پہلے اس سماجی مرض کی تشخیص کریں جو پاکستان کی سائنسی پسماندگی کا اصل سبب ہے ورنہ ہم ابد تک کریلے کی بیل سے خوشۂ انگور کی امید کرتے رہیں گے۔

سائنس کیا ہے؟

اگرچہ لفظ "سائنس" کا استعمال بے حد عام ہے تاہم اسکا صحیح مطلب نہ مشینیں ہے اور نہ ہی آلات یا کیمیاوی مرکبات۔ فارمولے اور ڈائگرام بھی سائنس کی روح نہیں ہیں۔

سائنس ایک طرز فکر کا نام ہے جو فقط عقل کی حاکمیت قبول کرتی ہے اور جس کے استدلال کی بنیادیں منقولاتی نہیں بلکہ تجرباتی ہیں کسی مفروضے کو ثابت کرنے کے لئے ڈارون یا نیوٹن یا آئنسٹائن کی شہادتوں کا سہارا نہیں لیا جاتا بلکہ اس کو تجربوں سے ثابت یا رد کیا جاتا ہے سائنس کے نہ پیر ہیں نہ پیغمبر۔ چنانچہ اس میں اختراعی قوتیں مسلسل کارفرما رہتی ہیں۔

میں سائنس کے نظریات اور دیگر قسم کے نظریات میں فرق واضح کرنا چاہتا ہوں ایک سائنسی تھیوری کی پہچان یہ ہے کہ اس میں نئی پیشگوئیاں کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے گویا ایسی تھیوری کے استعمال سے نہ صرف تمام موجودہ تجربات اور مشاہدات سمجھے جا سکتے ہیں بلکہ مزید تجرباتی نتائج اور آنے والے مشاہدات کی پیشگوئی بھی کی جاتی ہے۔ سائنسدان کسی سائنس کی تھیوری کو حرف آخر نہیں سمجھتے ہیں، وہ تھیوری کو مسلسل پرکھتے ہیں اور اس کی پیشگوئیوں کا مقابلہ مشاہدات یا تجرباتی نتائج سے کرتے ہیں۔ سر کارل پاپر کے بقول کوئی تھیوری "سائنسی" کہلانے کی حقدار نہیں جب تک اس کو یوں غلط ثابت کرنا ممکن نہ ہو۔

ان باتوں کی وضاحت ہم ایک تاریخی مثال سے کریں گے: ۱۶۸۶ء میں نیوٹن نے کشش ثقل کی تھیوری مرتب کی تھی۔ اس زمانے میں دم دار ستارے یعنی COMET کے متعلق دو قسم کے نظریات پائے جاتے تھے۔ ایک طرف انگلینڈ کے سارے عوام اس نظریہ کے قائل تھے کہ خدا ان دم دار ستاروں کو قحط، سیلاب، زلزلے اور مختلف قدرتی آفات کے پیش خیمہ کے طور پر بھیجتا ہے، دوسری طرف ایک ماہر فلکیات HALLEY نے خیال ظاہر کیا کہ پتھروں کی حرکت کی طرح دم دار ستارے بھی نیوٹن کی تھیوری کے پابند ہیں۔ اگر یہ محض خیال کی حد تک رہتا تو شاید عوام کے وہمی نظریہ سے مختلف نہ ہوتا۔ مگر ہیلی نے ایک مخصوص خوف پیدا کرنے والے ستارے کا مشاہدہ چند مہینوں تک کیا اور نیوٹن کے قوانین کا اس پر اطلاق کرکے یہ پیشگوئی کی کہ وہی ستارہ ۷۶ سال بعد آسمان کے ایک خاص مقام پر نظر آئے گا، یہ بات انتہائی حیران کن تھی مگر ٹھیک ۷۶ سال بعد، جب ہیلی اور نیوٹن کب کے دفن ہو چکے تھے ہیلی کا کومیٹ عین اسی مقام پر

نمودار ہوا۔

سائنس کا مقصد اعلیٰ کائنات کا نظام سمجھنا ہے اور سائنس کا بنیادی مفروضہ ہے کہ انسان اس کام کا اہل ہے۔ گو کہ اب بھی کئی معمے باقی ہیں اور ہمارا علم ناکافی ہے، تاہم اس میں شک نہیں کہ سائنس نے اپنی منزل کی جانب بے پناہ ترقی کی ہے۔ مادہ اور روشنی کی ماہیت کے متعلق ہم نے اس صدی میں صحیح واقفیت حاصل کی ہے۔ ماہرین طبعیات PHYSICISTS نے دریافت کیا ہے کہ ہر قسم کا مادہ ایٹموں کا بنا ہوا ہے اور تمام تر ایٹم ایک ہی بنیادی اصول یعنی تعدیل شروڈنگر SHRODINGER EQUATION کے پابند ہیں۔ ایٹم کا مرکزہ بھی اس صدی کی دریافت ہے اور اسی مرکزہ سے نیوکلیر توانائی حاصل کی جاتی ہے تقریباً ۲۰ سال پہلے ہم نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ مرکزہ جن ذرات پر مشتمل ہے، یعنی پروٹون اور نیوٹرون وہ ذرات خود دوسرے ذرات پر مشتمل ہیں جن کو QUARKS کہا جاتا ہے دوسری طرف فزکس کے قانون نے ہمیں موسم، زلزلے، شہاب ثاقب اور دوسرے قدرتی مظاہر کا علم دیا ہے جس سے ان دیکھی قوتوں کی نفسیاتی ضرورت مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے خلائی سفر سے ہم نے شمسی نظام کے تمام سیاروں پر حیرت انگیز معلومات حاصل کی ہیں۔ اب سائنسدان وثوق سے کہتے ہیں کہ کائنات پندرہ ارب سال پہلے ایک مٹھی کے برابر آگ کا گولہ تھی جو ہولناک دھماکے سے پھٹا اس کے نتیجہ میں سارا مادہ خلا میں منتشر ہو گیا اور ہزاروں صدیوں کے بعد اس مادے سے ستارے، سورج، زمین، چاند بنے۔

قوانین قدرت سمجھنے کے ساتھ ساتھ انسان نے سائنس کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال بھی کرنا شروع کیا، چاہے وہ استعمال اس کی بہتری کے لئے ہو یا ابتری کے لئے۔ سائنس کے اطلاق سے انسان نے اپنی تاریخ کا رخ بدل دیا اور یوں اس میں اپنی صلاحیتوں کا احساس اجاگر ہوا۔

جدید سائنس کی مختصر تاریخ

یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنس ہر قسم کے معاشرتی اور معاشی حالات میں ترقی اور فروغ

نہیں پاتی۔ تو پھر وہ کون کون سے حالات ہیں جو سائنس کی نشو و نما کے لیے ساز گار ماحول فراہم کرتے ہیں، اس اہم ترین سوال کا جواب تاریخ کے مطالعے کے بغیر نہیں دیا جا سکتا۔

سائنس کے مؤرخین اس کی ترقی کے اسباب پر متفق نہیں اور دو مختلف قسم کے افکار اور رویے پائے جاتے ہیں[۱،۲]۔ ایک طرف وہ مؤرخین ہیں جو سائنس کو انسانی تجسس اور تخلیقی قوتوں کا مظہر سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تمام بنی نوع انسان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ سائنس جانچنے اور پرکھنے کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف مارکسی خیالات کے مؤرخین ہیں جو اس پہلو کو نسبتاً کم اہمیت دیتے ہیں۔ بقول ان کے اس کے علاوہ سائنس معاشرے کی پیداواری ضروریات کے تابع ہوتی ہے۔ ان دو گروہوں کے خیالات کی بابت میں فی الحال مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا، البتہ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ سائنس کو تمام نظریاتی بندشوں سے آزاد ہونا چاہیئے۔

جدید سائنس کے دور کا آغاز فقط چار سو سال پہلے یورپ میں ہوا، ۱۷ ویں ۱۸ ویں صدیاں یورپ میں صنعتی انقلاب، سیاسی انقلاب اور روشن خیالی کا دور تھا۔ ڈیکارٹ، نیوٹن، والیٹر، روسو، ڈیڈرو، کانٹ، بے شمار ایسے مفکرین اور سائنس دان پیدا ہوئے جنہوں نے معاشرے کے افکار اور اقدار کا رخ بدل دیا۔ اس دور سے قبل کلیسا کے ہزار سالہ دور اقتدار نے یورپ کو علوم وفنون سے بیگانہ کر دیا تھا اور ہر سمت تعصب، تنگ نظری اور توہمات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کلیسا نے عقل اور خرد پر پہرے بٹھائے ہوئے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ کلیسائی عقائد سے سر مو اختلاف کرے۔ ہر جگہ مذہبی عدالتیں قائم تھیں جن کے فیصلوں کی نہ داد تھی نہ فریاد۔ چنانچہ لاکھوں بے گناہ بے دینی اور جادوگری کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ ان کو ٹکٹکی پر باندھ کر پہلے کوڑے لگائے جاتے تھے پھر ان کی ہڈیاں توڑ دی جاتی تھیں اور لاشوں کو سڑک پر گھسیٹا جاتا

[1] J. D. Bernal, *Science in History* (Cambridge: MIT Press, 1981)

[2] A. Mckenzie, *The Major Achievements of Science*, Vol. I (Cambridge: Cambridge University Press, 1960).

تھا، مُردوں کو بھی بخشا نہیں جاتا تھا مشہور زمانہ آرچ بشپ اُشر ایک کلیسائی پروہت تھے جنہوں نے انجیل کے مطالعہ سے اخذ کیا کہ زمین بروز اتوار ۲۳ اکتوبر چار ہزار چار سو قبل مسیح کو بنائی گئی تھی۔ اس انکشاف سے کچھ سال پہلے واٹکلف نامی ایک سائنسدان نے قدیم زمانے کے جانوروں کی ہڈیاں کا تجزیہ کیا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ زمین کم از کم دس لاکھ سال پرانی ہے اُشر کے حکم پر واٹکلف کی لاش قبر سے کھود کر نکالی گئی، اس کی ہڈیوں کو پیسا گیا، اور جو کچھ باقی رہا اسے دریا میں بہادیا گیا تاکہ بغاوت اور اختلاف کے جراثیم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔

اس ہولناک ماحول میں علوم و فنون کیا ترقی کرتے؟ تعلیم کلیسا کی اجارہ داری تھی لہٰذا درسگاہوں میں فقط وہی علوم پڑھائے جاتے تھے جن سے کلیسا کے عقائد کو تقویت ملتی معقولات کی جگہ منقولات، درایت کی جگہ روایت اور اجتہاد کی جگہ تقلید۔ کسی استاد کو شرعی احکام پر شک کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ کلیسا کی خرد دشمنی نے ذہنوں کو مفلوج کر دیا تھا اور اسی سبب اسلامی تہذیب کے شاندار سائنسی کارناموں سے یورپ عرصہ دراز تک مستفید نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود یورپ میں سائنسی تجربات عربی تصانیف کے لاطینی ترجموں کے بعد ہی شروع ہوئے۔ اس دور کے ممتاز سائنسدان روجر بیکن نے ابن ہیثم کی بصریات پر تجربے شروع کئے تو کلیسا کی طرف سے باقاعدہ نگرانی شروع ہو گئی۔

بیکن پر مذہبی عدالت نے الزام لگایا کہ

"تمہاری تحریروں میں عجیب و غریب خیالات پائے جاتے ہیں"

اور قید کی سزا سناتے وقت عدالت نے اسے تنبیہ کی کہ

"علم و حکمت کا درخت بندوں کو شجر حیات سے گمراہ کر دیتا ہے اور جہنم کے ہولناک عذابوں کی تمہید ہوتا ہے"

مسلمانوں کی سائنس کا طلوع اور زوال

جس زمانے میں یورپ اندھیری قوتوں کی گرفت میں تھا، وہی زمانہ مسلمانوں کے سیاسی اور سائنسی عروج کا دور تھا۔ مشہور سائنسی رسالہ نیچر (۳) کا اقتباس پیش ہے۔

"آج سے ہزار سال قبل اپنے عروج کی انتہا پر عالم اسلام نے سائنس میں اور خصوصاً ریاضی اور طب کے میدانوں میں نمایاں کارنامے سرانجام دیئے۔ اپنے دور عروج میں بغداد اور جنوبی اسپین میں یونیورسٹیاں قائم تھیں جہاں تحصیل علم کے لئے ہزاروں افراد جوق در جوق آتے تھے، حاکموں کے گرد سائنسدانوں اور فنکاروں کا مجمع ہوتا۔ آزاد خیالی کی فضا میں یہودی، عیسائی اور مسلمان باہم مل کر کام کر سکتے تھے۔ آج یہ سب بس ایک یاد رفتہ ہے"

مسلمان سائنسدانوں کے عظیم کارناموں (۴) کی تفصیل یہاں پر دینا ضروری نہیں ہے البتہ ہمیں بھولنا نہیں چاہئے کہ یہ ترقی رواداری اور روشن خیالی کا نتیجہ تھی، جب تک کسی نہ کسی صدر مقام میں شہزادے اور وزراء، سائنس کی سرپرستی میں مسرت، فائدہ یا شہرت پاتے رہے مشعل راہ جلتی رہی۔ شرفا کی حمایت نے سائنسدانوں کو ملائیت کے غیظ و غضب سے کچھ وقت تک تحفظ بخشا۔ خصوصاً المامون (۸۱۳-۸۳۳) نے معتزلیوں کی تائید کی اور ان کو اشعری اور دیگر مذہبی انتہا پسندوں سے بچایا۔ معتزلہ دعویٰ کرتے تھے کہ اسلام کی بنیاد صرف ایمان ہی نہیں سائنس اور منطق بھی ہیں۔

آخر کار مسلمانوں کی سائنس ملاؤں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ بیشتر مسلمان سائنسدان وطن بدری پر مجبور ہو گئے اور ان میں ابن سینا اور ابن خلدون کے نام بھی ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں کی سائنس کے زوال میں کئی اور عناصر بھی کارفرما تھے، لیکن مورخین بتاتے ہیں کہ رواداری اور روشن خیالی کا ختم ہونا ایک بہت اہم وجہ تھی۔

مسلمانوں کی سائنسی نشاۃ ثانیہ کی کوششیں

کئی مسلمان مفکروں نے ماضی کی عظمتوں کا تجزیہ کیا ہے اور نشاۃ ثانیہ کی تمنا کی ہے۔ سر سیّد احمد

.Francis Ghiles. 'What is Wrong with Muslim Science?' *Nature*, 24 March 19
George Sarton. *Introduction to the History of Science*, Vol. I (Baltimore,
۵۔ مذہب اور سائنس کے موضوع پر سر سید کے خیالات سبط حسن کی کتاب "نوید فکر" میں بہت فصاحت سے بیان کئے گئے ہیں

خان کو اس ضمن میں خاص مقام حاصل ہے۔ سر سید ایک دور اندیش اور روشن خیال شخص تھے کیونکہ آجکل کے اسکول اور کالج کی نصابی کتابوں سے ایسا تاثر نہیں ملتا۔

سر سید نے برصغیر کے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا اس وقت بیڑا اٹھایا جب مسلمان انگریزوں کے ظلم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اصلاح احوال جلد ہونا چاہیئے۔ ورنہ ان کے بقول، "مسلمان سائیس، خانساماں، خدمتگار اور گھاس کھودنے والوں کے سوا اور کچھ نہ رہیں گے" انہوں نے دیکھا کہ مسلمان توہم پرستی کو اصل اسلام سمجھتے ہوئے مولویوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ اور انگریزی زبان اور مغربی علوم کو نفرت سے دیکھتے ہیں۔ سر سید سے دو سو سال پہلے شیخ احمد سرہندی اور دیگر مشائخ و علماء نے ریاضی اور سائنس کے خلاف فتوے سنا دیئے تھے اور سختی سے تلقین کی کہ مسلمانوں کی تعلیم خالصتاً مذہبی نوعیت کی ہونی چاہیئے۔ مگر سر سید نے انہیں رویوں کو مسلمانوں کے ذلیل و خوار ہونے کی وجہ بتائی۔ مروجہ مذہبی تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"اب میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ جو جو کتب مذہبی اب تک ہمارے ہاں موجود ہیں اور پڑھانے میں آتی ہیں ان میں سے کونسی کتاب ہے جس میں فلسفہ مغربیہ اور علوم جدیدہ کے مسائل کی تردید یا تطبیق مسائل مذہبیہ سے کی ہو۔ اثبات حرکت زمین اور ابطال حرکت و دوری آفتاب پر جو دلیلیں ہیں ان کی تردید کس سے جا کر پوچھوں؟ پس ایسی حالت میں ان مذہبی کتابوں کا نہ پڑھنا ان کے پڑھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ہاں، مسلمان مرد میدان ہیں اور اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں تو بے دھڑک میدان میں آویں اور جو کچھ ان کے بزرگوں نے فلسفہ یونانیہ کے ساتھ کیا وہ مغربیہ اور علوم محققہ جدیدہ کے ساتھ کریں۔ تب ان کا پڑھنا مفید ہوگا، ورنہ اپنے منہ میاں مٹھو کہہ لینے سے کوئی فائدہ نہیں"

سر سید کا موقف یہ تھا کہ منقولات کی اندھی تقلید کو رد کر کے اجتہاد اور تحقیق کا راستہ اختیار کیا جائے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ سائنس کی دریافت اور ایجادات نے کائنات کی اصل حقیقت ہم پر روشن کر دی ہے۔ سائنسی علوم سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قوانین قدرت کو کوئی ماورائی

طاقت نہیں بدلتی بلکہ دنیا میں جو کچھ وقوع پذیر ہے خواہ اس کا تعلق مادی اشیاء سے ہو یا انسانی معاشرے سے، اس کے اسباب دنیاوی ہوتے ہیں لہٰذا مسلمانوں کے دنیاوی مسائل دعا، تعویذ، پیروں کی جھولیاں بھرنے سے نذر و نیاز، وغیرہ سے حل نہیں ہوں گے بلکہ توہمات کا سحر توڑنے ہی سے نجات ممکن ہے۔

سرسیدؒ نے قرآنی آیات کی تشریح و تاویل عقلی بنیادوں پر کی۔ اس کے برعکس علماء دین فرماتے تھے کہ موجودات عالم کی جو تشریح سائنس دان کرتے ہیں وہ قرآن سے ٹکراتی ہیں مگر کلامِ خدا چونکہ غلط نہیں ہو سکتا لہٰذا سائنس کی تشریحات لامحالہ غلط ہیں۔ سرسیدؒ نے اس منطق کو قبول نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ موجوداتِ عالم کی سائنسی تشریحیں صحیح اور ثابت شدہ ہیں لہٰذا ہم کو کلامِ خدا کے معنی اور مفہوم انہیں سچائیوں سے متعین کرنے ہوں گے چنانچہ انہوں نے کائنات کی تخلیق، آدم و حوا کا ہبوط، آسمان، وحی اور الہام کی اصل حقیقت، فرشتے، جن اور شیطان، حشر و نشر، معراج، معجزے اور کرامات وغیرہ کی تمثیلی اور عقلی تشریحیں کیں۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت نوحؑ وغیرہ کے قصوں میں جو واقعات قانونِ قدرت کے خلاف معلوم ہوتے تھے وہاں عقلی تشریحیں کیں۔ اس کے بعد سرسیدؒ پر علماء گرجتے رہے اور برستے رہے اور ہر طرف سے کفر اور الحاد کے فتوے لگائے گئے، اس حد تک کہ کعبہ شریف کے متولی نے سرسیدؒ کو واجب القتل قرار دیا۔

علماء کرام اور جدید سائنس

اب تاریخی مطالعہ کو چھوڑ کر ہم دورِ حاضر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

سرسیدؒ کے زمانے کے مقابلے میں برصغیر کے مسلمانوں کے حالاتِ زندگی یقیناً بہتر ہوئے ہیں۔ اغیار کا تسلط اب نہ رہا اور مسلمانوں کا ایک الگ ملک موجود ہے جس میں سینکڑوں تعلیمی اور تحقیقی ادارے قائم ہیں۔ مگر شاید یہ وہ سحر نہیں جس کا انتظار تھا۔ ان اداروں میں نہ تعلیم ہے نہ تحقیق۔ اتفاقاً جو تھوڑی بہت باقی رہ گئی ہے وہ بھی تیزی سے معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس ایک نئے قسم کی سائنس اہلِ اقتدار کی سرپرستی سے پروان چڑھ رہی ہے۔ نومبر ۱۹۸۳ء کی "اسلامی سائنس کانفرنس"، جو اسلام آباد میں منعقد ہوئی تھی (اور جس پہ ۴۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوا) اور اس قسم کی

دیگر کانفرنسوں سے ہم دیکھتے ہیں کہ ملک میں ایک نئی روش تشکیل پائی ہے جو اصل سائنس کو رد کرتی ہے اور اسے مغرب زدگی کی ایک علامت قرار دیتی ہے۔ پرزور انداز میں سائنس کو ایک نظریاتی مضمون قرار دیا جاتا ہے اور اسلامی سائنس کو مغربی سائنس سے علیحدہ اور برتر بتایا جاتا ہے ایسے افکار جماعت اسلامی کی مطبوعات میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً محترمہ مریم جمیلہ، جو اس جماعت کی ایک اہم دانشور کہلاتی ہیں، لکھتی ہیں(۷)؛

Modern Science is guided by no moral values, but naked materialism and arrogance. The whole branch of knowledge and its applications is contaminated by the same evil. Science and technology are totally dependent upon the set of ideals and values cherished by its members. If the roots of the tree are rotten, then the tree is rotten; therefore all its fruits are rotten.[14]

محترمہ کے بقول مغربی سائنس مادہ پرستی اور گھمنڈ پر استوار ہے اور اسی سبب وہ الحاد اور لادینیت پھیلاتی ہے۔ اجتہاد اور اختراع پر تنقید کرتی ہوئی وہ لکھتی ہیں کہ(۸)؛

(In Islamic society) originality, innovation and change were never upheld as intrinsic values. The ideal of Islamic culture was not mechanical, evolutionary progress but the permanent, immutable, transcendental, divinely revealed moral, theological, and spiritual values of the Qur'ān and *Sunnah*.[15]

محترمہ جمیلہ کے لئے مسلمانوں کی سائنسی پسماندگی نہ تاسف اور نہ ہی ملامت کا سبب ہے، بلکہ ان کے لئے یہ پسماندگی باعث فخر و مسرت ہے۔

جماعت اسلامی کے بانی، مولانا ابوالاعلیٰ المودودی، بھی مغربی سائنس سے بیزار تھے۔ 6
مولانا صاحب اپنی ایک تحریر میں شکایت کرتے ہیں کہ جغرافیہ، طبعیات، کیمیا، حیاتیات، حیوانیات، ارضیات، معاشیات اور دیگر سائنسی مضامین خدا اور رسول کا نام لئے بغیر پڑھائے جاتے ہیں اور یوں گمراہی کے باعث ہیں کہ(۹) فرماتے ہیں کہ؛

"جدید تعلیم و تہذیب کے مزاج اور اس کی طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ

۹۔ "تعلیمات"، ابوالاعلیٰ المودودی، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، ص ۲۰۔

Maryam Jameelah, *Modern Technology and the Dehumanization of Man* (Lahore: El-Matbaat-ul-Arabia, 1983), p.8.

وہ اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ آپ نوخیز نسلوں کو فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول سے یکسر مختلف ہے اس کے بعد کس بناء پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی۔؟"

سید مودودی صاحب تمام برائیوں کا سدِّ باب ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں[۱۰]

"یہ ساری خرابی۔۔ دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کا نتیجہ ہے اور جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں یہ تقسیم بالکل اسلامی نقطہ نظر کے خلاف ہے نئے نظام تعلیم میں دینیات کے الگ کورس کی ضرورت نہیں بلکہ سارے کورس کو دینیات کے کورس میں تبدیل کر دینا چاہیئے۔"

اس طرح کے خیالات جماعت اسلامی کی حد تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ان سے ملتے جلتے افکار باقی اسلامی ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایران کے سید حسین نصر صاحب بخوشی اقرار کرتے ہیں کہ اسلام جدید سائنس کو رد کرتا ہے۔ لندن سے شائع کردہ ایک کتاب میں وہ فرماتے ہیں[۱۱]

The fact that science and technology in its present form did not develop in Islam's bosom is not a sign of decadence, as is claimed, but the refusal of Islam to consider any form of knowledge as purely secular.[18]

۱۰۔ ایضاً، ص ۸۶

Sayyed Hossein Nasr, *The Encounter of Man with Nature* (London: George Allen and Unwin Ltd., 1968), p. 94.

گویا، سید نصر صاحب کے بقول، اسلام تمام ایسے علم کو فوراً مسترد کرتا ہے جس کی نوعیت مذہبی نہ ہو۔ شاید یہی سبب ہے کہ ایک اسلامی جریدہ، جو لندن سے شائع ہوتا ہے، پروفیسر عبد السلام کی WEAK AND ELECTROMAGNETIC قوتوں کے اتحاد کو مسترد کرتا ہے کیونکہ اس جریدے کے بقول، پروفیسر سلام "مدعی صوفیوں کے عقیدۂ وحدت الوجود" کے پیروکار بن گئے ہیں[12]۔

اگرچہ یہ لیکچر پاکستان کے متعلق ہے، اس کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ بعض اسلامی ممالک میں جدید سائنس کی مخالفت اور بھی زیادہ شدت سے کی جاتی ہے۔ اب سے چند ماہ قبل ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس کویت میں منعقد ہوئی تھی جس میں عرب کی سترہ یونیورسٹیوں کے ریکٹروں نے شرکت کی۔ کانفرنس کا مقصد تھا کہ ان مسائل پر غور و خوض کرنا تھا جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول کو متاثر کرتے ہیں مگر فقط ایک ہی مسئلہ زیر غور رہا: آیا سائنس اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟ ہمارے سعودی برادران کی متفقہ رائے تھی کہ ٹیکنالوجی کا حصول درست اور اسلامی ہے مگر خالص سائنس لادینیت کی جانب اکساتی ہے اور اس کی زیادہ حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔

دائیں بازو کی تحریروں میں جدید سائنس سے نفرت کثرت سے پائی جاتی ہے۔ البتہ "اسلامی سائنس" کو برا نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن اس نقطہ پر پہنچ کر ایسے مصنفین لاشعوری طور پر تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ "اسلامی سائنس" سے ایسی سائنس مراد لیتے ہیں جو ماضی میں مسلمانوں کے ہاتھوں پرورش پائی تھی۔ مگر یہ سائنس صرف مسلمانوں کی نہیں تھی! مسلمانوں نے ارسطو، سقراط، افلاطون اور دیگر یونانی فلسفیوں کے علم کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اسی لیے اس میں وسعت اور جدت پیدا کر سکے تھے۔ یہ کوئی شرم کی بات نہیں، مگر ان مصنفوں کو یونانیوں کا مقروض ہونا اتنا ناگوار معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذکر کم سے کم کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس حقیقت پر بے انتہا زور دیا جاتا ہے کہ مغربی سائنس مسلمانوں کے قدیم علوم

۱۲۔ پروفیسر عبد السلام "اسلامی ممالک میں سائنسی و تکنیکی ترقی۔ ماضی حال اور مستقبل"، ترجمہ ڈاکٹر انیس عالم، لاہور۔

کی مرہونِ منت ہے لیکن وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ مغربی سائنس کو رد کرنا مسلمانوں کی سائنس کو رد کرنے کے عین مترادف ہے کیونکہ دونوں کی بنیادیں ایک ہی ہیں۔

نئی "اسلامی سائنس" اسلام اور سائنس کی توہین ہے

گزشتہ چند سالوں سے "اسلامی سائنس" کی اصطلاح کو ایک دوسرے مفہوم سے بھی تعبیر کیا جا رہا ہے۔ گویا اسلامی سائنس کا مطلب صرف مسلمانوں کی سائنس نہیں بلکہ یہ اس چیز کا نام ہے جو سائنس کی تمام تھیوریاں اور قدرت کے تمام حقائق قرآن شریف کی تفہیم و تفسیر سے اخذ کرتی ہے۔

دورِ حاضر کے چند اسلامی سائنس دانوں کی عجیب و غریب خیال آرائیاں ملاحظہ فرمائیے:

پہلے ایک پروفیسر کی مثال پیشِ خدمت ہے جو فزکس کے Ph.D ہونے کے علاوہ ایک مذہبی جماعت کے لئے مبلغ کے فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں۔ یہ پروفیسر صاحب ATDO اور PCSIR کے سابق چیئرمین ہیں اور اب بھی ملک کے سائنسی معاملات میں پیش پیش ہیں۔ ایک تازہ خبر کے مطابق وہ اقوام متحدہ کے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کمیشن میں پاکستان کی نمائندگی فرما رہے ہیں۔ یہ پروفیسر صاحب بہت سی تھیوریز کے موجد ہیں۔ ان کی ایک تھیوری میں ثابت کیا گیا ہے کہ جنت زمین سے دور بھاگتی جا رہی ہے۔ بتاتے ہیں کہ EINSTEIN'S THEORY OF RELATIVITY کے اطلاق سے انہوں نے دریافت کیا ہے کہ اس حرکت کی رفتار روشنی کی رفتار سے ایک CM/SEC کم ہے۔ پھر ایک دوسری تھیوری میں سات آسمان کو ایٹم کی مانند بتایا گیا ہے۔ ان کے بقول جیسے ایٹم کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں اور توانائی جذب یا خارج کرنے سے ایک سطح سے دوسری سطح تک پہنچا جاتا ہے، ویسے ہی ثواب یا گناہ پانے سے ایک سے دوسرے آسمان تک جایا جاتا ہے۔

ایک دوسرے سائنس دان کی انتہائی مفید اور حیرت انگیز تجویز پر غور فرمائیں: ڈاکٹر

بی ایم پاکستان ایٹامک انرجی کمیشن کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ انہوں نے قرآن شریف کے بغور مطالعہ سے جان لیا ہے کہ جنات ایک آزاد اور آتشی قوت ہیں جن میں بے پناہ توانائی پوشیدہ ہے۔ لہٰذا وہ تجویز کرتے ہیں کہ اس آتشی قوت کو ایندھن کے طور پر استعمال میں لانا چاہئیے اور یوں تیل کے بحران کا مستقل حل پایا جائے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے مطابق جنّت ایک بلیک ہول BLACK HOLE ہے (یہ ایک ایسا ستارہ ہے جس میں سے کوئی شے برآمد نہیں ہو سکتی اور روشنی بھی اس سے باہر نہیں نکل سکتی) ہے۔

آج کل پاکستان کے بک اسٹورز میں ایسی کتابوں کی بھرمار نظر آتی ہے جو مذہبی استدلال سے ہر قسم کے سائنسی حقائق کی تاویل کرتی ہیں۔ مثلاً لاہور کے مشہور پبلشرز واجد علی نے انتہائی مہنگی اور خوبصورت کتاب چھاپی ہے جس میں کسی انجنیئر نے ثابت کیا ہے کہ جنّت نہیں بلکہ دوزخ ایک بلیک ہول BLACK HOLE ہے۔ پھر ایک اسلام آباد کے رہنے والے محمد منیر صاحب ہیں جو اپنی کتاب میں کہتے ہیں کہ ایٹم کے اندر ذرّوں کی کشش صرف میکانکی نہیں بلکہ روحانی ہے، لکھتے ہیں(۱۳)

We must take these atomic charges as carved out of spiritual attractions and not simply the blind electromagnetic forces that the materialists would make us believe. It is strange that while people indulge in loving and chasing each other in their capacity as men and women they have never appreciated the scientific reality in their own division in sexes.[21]

ایک آخری مثال ایک ایسے سائنسدان کی جو غیر ملکی ہے مگر جس نے اپنا مقالہ اسلام آباد کی منعقد اسلامی سائنس کانفرنس میں پڑھا تھا۔ ان کے مقالے سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے(۱۴)

God cannot be one highest monad, a source where all souls rest: a crosspoint of high multiplicity N-1 is overstrained by congestion/stagnation/deflection under the angle pi/N. God can be identified with the substance free and immovable rotation axis of time in the universal carousel of space.[22]

سمجھنے والے حضرات نے پہچان لیا ہوگا کہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کا زاویہ ANGLE نکالنے

کی کوشش کی ہے! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

ہم نے اب بہت ساری ایسی مثالیں دیکھ لی ہیں جن میں قدرتی حقائق کو قرآن سے منسوب کیا گیا ہے مگر ایک نئی کاوش بھی قابلِ ذکر ہے۔ آجکل بعض اسلامی سائنسدان کمپیوٹر کی مدد سے قرآن پاک کو کلامِ خدا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کوئی ان حضرات سے جا کر پوچھے کہ اگر ان کے کمپیوٹر پروگرام یا اس کے لاجک میں کوئی نقص نکل آئے تو کیا قرآن کو انسان کا لکھا ہوا ماننا چاہیئے؟

اسلامی سائنسدانوں کی تمام تر کاوشوں کا سرچشمہ یہ ایمان ہے کہ مذہب اور سائنس کو یک جان ہونا چاہیئے۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر، غلط یا صحیح انداز سے، وہ مولانا مودودی کی اس تحریر پر عمل کرتے ہیں جس میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ:[15]

"قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اب تک کی جمع شدہ سائنٹیفک معلومات کا جائزہ لیا جائے بلکہ آثارِ فطرت کے مزید مشاہدے اور قوانین فطرت کی مزید دریافت کا کام بھی انہی خطوط پر کیا جائے جو قرآن نے کھینچ دیئے ہیں۔"

مورخوں کا کہنا ہے کہ یورپ کے عہد تاریک میں عالموں کی توجہ چڑیلوں کی شناخت، دوزخ کی ہیبت ناک اذیتوں، آسیب اور غیر مرئی قوتوں کی پہچان پر مبذول تھی۔ منطق کے حوالے سے بحث کی جاتی تھی کہ کیا خدا ایسا پتھر بنا سکتا ہے جو وہ خود نہ اٹھا سکے؟ یا، ایک سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیک وقت کھڑے ہو سکتے ہیں؟ اگرچہ ہم ان کو بیکار اور بے ہودہ سوال سمجھتے ہیں، لیکن اس زمانے میں ان کے جوابات سختی سے منوائے جاتے تھے اور اس شخص کی خیر نہ ہوتی جو اختلاف کی مجال کرتا۔

یقیناً اس زمانے کے اسلامی سائنسدانوں کو یورپ کا بیتا ہوا دور خوب راس آتا۔ اس نئی سائنس کا تعلق نہ سائنس سے ہے اور نہ ہی اسلام سے۔ یہ خرافات عقل کی نفی اور توہمات کا مظہر ہیں۔ اگرچہ ظلمت کے پرچاری اور خبطی دنیا کے ہر ملک میں بستے ہیں تاہم انہیں ہر ملک

۱۵۔ "تعلیمات"، صفحہ ۹۲

میں اونچے عہدوں سے نوازا نہیں جاتا، نہ سائنس کی تعلیم و تحقیق ان کے سپرد کیجاتی ہے، اور نہ ہی ان کو عالمی سطح کی کانفرنسوں میں نمائندگی سونپی جاتی ہے۔

ہمارا تعلیمی نظام تقلید اور توہم پرستی کو تقویت پہنچاتا ہے۔

ہم نے واضح کیا ہے کہ سائنس اور توہمات آگ اور پانی کا رشتہ رکھتے ہیں۔ گویا سائنس اور توہمات ایک دوسرے کے لیے انتہائی مہلک ہیں چنانچہ سائنسی ترقی کا انحطاط سمجھنے کے لئے ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ مروّج توہمات کیوں اور کیسے قائم رہے ہیں۔

توہم پرستی کے معنی سے ہم سب بخوبی مانوس ہیں۔ یہ معاشرے کے ہر طبقے اور ہر گوشے میں رچی بسی ہوئی ہے، چاہے معاملہ کھانے پینے کا ہو، یا بچوں کی پرورش کا ہو، یا شادی بیاہ کا ہو، یا روزگار کا ہو۔ توہمات کا مسکن صرف گھریلو ماحول ہی نہیں بلکہ عام اخبارات "موت کا منظر مرنے کے بعد کیا ہوگا" جیسی کتابیں، ڈائجسٹ وغیرہ توہمات کو مشتہر کرتے ہیں اور تقویت پہنچاتے ہیں۔

بعض اوقات توہم پرستی کے نتائج انتہائی المناک ہوتے ہیں۔ ہاکس بے کا مشہور واقعہ ایک ایسی مثال ہے جب جذبۂ ایمانی سے سرشار عقیدت مند کربلا پہنچنے کے ارادے سے کراچی کے سمندر میں کود پڑے جس کے بعد بیس سے زیادہ لاشیں پانی سے برآمد ہوئیں پھر وہ واقعہ ہے جس میں ایک صاحب نے خواب دیکھا جس میں ان کو حکم ہوا تھا کہ اپنے بیٹے کو قربان کر دو۔ چنانچہ انہوں نے سُنّتِ ابراہیمؑ کی تقلید میں بیٹے کو ذبح کر دیا۔ اور آپ نے اس بانجھ عورت کا قصّہ بھی سُنا ہوگا جس نے کسی کے کہنے میں آکر اپنے پڑوسی کا بچہ قتل کیا اور اس کے خون سے نہائی تاکہ اولاد ہو۔ اس طرح کے ہزار اور قصّے ہیں جو بظاہر دیوانوں کے افعال ہیں لیکن جو درحقیقت ایک تباہ کن سماجی مرض کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر یہ مرض ان پڑھ طبقوں تک محدود ہوتا تو بات قابلِ فہم ہوتی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اعلیٰ ڈگری یافتوں میں بھی توہم پرستی اور خرد دشمنی اکثر اوقات اسی شدّت سے پائی جاتی ہے۔

اگر تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ توہمات صرف انسان کی جہالت اور لاعلمی کے باعث پیدا ہوئے۔ جوں جوں سائنسی علوم نے ترقی کی تو بیماری کے اصل اسباب سمجھ میں آئے اور بادل، بارش، بجلی کی حقیقت معلوم ہوئی نتیجتاً بھوتوں کا عقیدہ کمزور ہوتا گیا عین اسی سبب سائنس کی تعلیم انسانوں کی نشو ونما کے لئے مفید ہوتی ہے مگر پاکستانی درسگاہوں میں سائنس اس مقصد سے نہیں پڑھائی جاتی۔

کچھ عرصہ پہلے مجھے "فکرِ نو" نامی ایک سائنسی رسالہ کا تازہ شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ رسالہ کراچی کے کسی ڈگری کالج کے سائنس کلب کا شائع کردہ ہے۔ رسالہ قابلِ ذکر صرف اس لئے ہے کہ وہ موجودہ دور کے اساتذہ اور طلبہ کی فکری کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔ پہلے اور سب سے نمایاں مضمون کا عنوان ہے "قرآن اور سائنس" جس میں ایک سائنس کے ٹیچر نے ڈارون کے ارتقاءِ آدم کی تھیوری پر اپنے قلم سے زبردست گولہ باری کی ہے۔ ایک دوسرے مضمون کا عنوان ہے "حیرت انگیز" جس میں ایسے ایسے معجزات اور کرامات بیان کئے گئے ہیں کہ لکھنے والوں کی عقلی صلاحیتوں پر حیرت ہونے لگتی ہے۔ مصنف سائنسدانوں کو للکارتا ہے کہ ان میں سے کسی کی بھی تاویل پیش کرے۔ پھر ایک اور مضمون سائنسدانوں کی زندگی کے دلچسپ واقعات کی بابت ہے جس میں بتایا گیا کہ بھاپ کا انجن اس وقت بنا جب جارج اسٹیفنسن نے کیتلی میں پانی ابلتے دیکھا اور کششِ ثقل کی تھیوری اس حادثہ کا نتیجہ ہے کہ نیوٹن باغ میں بیٹھا تھا اور ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر اس کے سر پر گرا۔ گویا سائنس کی ترقی محض ان حادثات اور اتفاقات کی مرہونِ منت ہے!

اگر "فکرِ نو" جیسے سائنسی رسالے ملک کے تعلیمی ماحول کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ واقعی کرتے ہیں تو توہم پرستی اور خرد دشمنی کو تعلیم سے کوئی خطرہ لاحق نہیں بلکہ ایسی تعلیم ان سماجی امراض کو زیادہ سخت جان بنا دیتی ہے۔ اندھی تقلید کی روایت اب تعلیم کی ہر سطح اور ہر پہلو پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ سائنس اور دیگر مضامین اب زیادہ سے

زیادہ حفظ کرنے کے انداز میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مکھی پہ مکھی مارنا قابلِ ستائش اور اچھے نمبروں کا ضامن ہے جبکہ سیکھنے اور پرکھنے کی کوشش ناپسند کی جاتی ہے۔ چنانچہ رٹتے ہوئے حقائق کے بوجھ تلے نوجوان ذہن پس کر مفلوج ہو جاتے ہیں اور ان میں تجسّس اور علم کا شوق باقی نہیں رہتا۔ اگرچہ تعلیمی نظام کے یہ عیب نئے نہیں ہیں لیکن حالات کا رجحان بھی بہتری کی جانب نہیں ہے۔ ایک طرف ٹیچروں کے معاشی مسائل تعلیمی اداروں میں انتظامیہ کی فال ملی اور بدعنوانی، اور غیر معیاری نصابی کتابوں کے مسائل زیادہ سنگین صورتحال اختیار کرتے جاتے ہیں۔ دوسری طرف تعلیمی نصابات کو سیاسی ضروریات کے تحت بدلا گیا ہے۔ مطالعۂ پاکستان کو تمام ڈگری کلاسز کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اب ناظرہ قرآن کے بغیر کوئی شخص میٹرک کا سرٹیفکیٹ حاصل نہیں کر سکے گا اور عربی زبان چھٹی جماعت کے بعد سے لازمی پڑھائی جاتی ہے نتیجتاً اس سے مضامین کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا ہے جو معقولات کے بجائے حافظے کی قوت آزماتے ہیں۔ چنانچہ ان اقدامات سے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ سائنس کی تعلیم کو مزید نقصان پہنچے گا۔

ایک نئی تحریک کی ضرورت ہے

آخر میں میں اس بات پر پھر زور دینا چاہتا ہوں کہ سائنس کی ترقی کے لئے سازگار ماحول کا ہونا اشد ضروری ہے۔ بین الاقوامی اداروں کے سامنے جھولی پھیلانا، یا نئے نئے تعلیمی اور تحقیقی اداروں کی تعمیر کرنا یا ذریعۂ تعلیم کو انگریزی سے اُردو کرنا یا اردو سے انگریزی کرنا یا نصابی کتب میں ردّو بدل کرنا سب کے سب ناکافی ہیں اگرچہ ان میں سے بعض پر عمل درآمد بہرصورت کرنا چاہئیے۔

لیکن اصل نجات کی راہ اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہے کیونکہ معاشرے کے اقدار اور روایات اس طرح سے بدلنے ہونگے کہ روشن خیالی، رواداری اور آزادیِ فکر و تحریر معاشرے کا بنیادی جزو بن سکیں۔ یہ فکری انقلاب کیسے برپا کیا جائے؟ میں اس انتہائی اہم اور مشکل سوال کا جواب دینے کا اہل نہیں ہوں۔ البتہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے عوام النّاس کو سائنس کی روح

سے آشنا کرنا ضروری ہوگا تاکہ وہ مروجہ توہمات کا مقابلہ عقل کی طاقت سے کر سکیں اور ان کے ذہن کے دریچے علم کی روشنی کے لئے کھل جائیں۔

سائنس کو مقبولِ عام کرنے کے لئے ہمیں ملک کی درسگاہوں پر انحصار نہیں کرنا چاہیئے ایک الگ تحریک کی ضرورت ہے جو وسیع پیمانے پر سائنس اور سائنسی سوچ کو عام کرے۔ ایک مشعل ہمارے لئے پہلے سے موجود ہے۔ ہندوستان کی عوامی سائنسی تحریک KSSP گزشتہ ۲۲ سال سے صوبہ کیرالہ کے گاؤں اور شہروں میں مصروف کار ہے اس کے بانی چند دانشور تھے لیکن اب یہ تحریک ۸۰۰۰ سے زائد کارکنوں پر مشتمل ہے اور اس کی سرگرمیاں ہر سال تیز ہوتی جا رہی ہیں۔ KSSP نے عام فہم سائنس کی ۲۰۰ مختلف کتابیں چھاپی ہیں اور ۲ سائنسی رسالے باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔ صرف بچوں کے سائنسی رسالے کی ۳۰۰۰ کاپیاں ماہوار تقسیم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ KSSP نے عوام میں دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر کئی سائنسی میلوں کا انتظام کیا، اسکولوں کے سائنسی نصابات میں ترمیم کی تجویزیں کیں، صحت اور طب پر خصوصی پروگرام شروع کئے اور صنعتوں کی پیدا کردہ آلودگی کے مسائل کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش ہے۔

پاکستان کے عوام کو بھی نئی راہ پر چلنے کی ضرورت ہے۔ بقول فیض ؎

اب صدیوں کے اقرار اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

اس فرمان کا نام سائنس ہے اور صرف اسی کی مدد سے ہمارے عوام دقیانوسی اور فرسودہ روایات ترک کر سکیں گے۔

ریسرچ فورم اس مضمون کے لئے "لاہور ایجوکیشن سوسائٹی" کا ممنون ہے۔

* * *

جسمانی ساخت اور عورت کی پسماندگی!

ایولین ریڈ

وہ عورتیں جو آزادیٔ نسواں کی تحریکوں میں شریک رہی ہیں اور بالخصوص وہ جنہوں نے اینگلس کی کتاب "خاندان، نجی ملکیت اور ریاست کی بنیاد" کا مطالعہ کیا ہے، یہ بات سمجھ پائی ہیں کہ عورت کی مظلومیت کی جڑیں دراصل طبقاتی سماج میں ہوتی ہیں۔

اُنہوں نے بجا طور پر سرمایہ دارانہ معاشرتی نظام کو جنسیت پرست کے القاب سے نوازا ہے جو طبقاتی سماج کا آخری مرحلہ ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے میں عورت کیخلاف امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

لیکن جو سوال عورتوں کو غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ان کی جسمانی ساخت کا انہیں کمتر اور ثانوی حیثیت کی مخلوق بنانے اور قائم رکھنے میں کوئی کردار ہے یا نہیں۔

جس معاشرے میں مرد کی بالادستی ہو اور اس صورتحال کو برقرار رکھنے کے لئے وہ نہ صرف تاریخ بلکہ سائنس پر بھی قابض ہو یعنی اپنی گرفت رکھے وہاں پر خواتین میں ایسی بے یقینی کی کیفیت کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں۔

عورت اور اس کی تاریخی حیثیت کے مطالعے کے لئے سائنس کے دو شعبے ہیں جن کی بنیادی بلکہ کلیدی اہمیت ہے، ــــــ یہ ہیں حیاتیات BIOLOGY اور بشریات ANTHROPOLOGY ۔ لیکن دونوں کو اسطرح پیش کیا جاتا ہے کہ عورت کے بارے میں حقائق کو اُجاگر نہ کیا جائے جبکہ بطور جنس مرد کے کردار کو خوب ابھار کر

پیش کیا جائے۔

عورت کی کمتری کے ثبوت میں جو سب سے گھٹیا اور نیم سائنسی پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے وہ جسمیات ہی کے بہانے ہوتا ہے۔ اس میدان میں من گھڑت افسانہ تراشوں کا کہنا ہے کہ عورت کا رحم اور بچہ جننے کا فعل اس کی جسمانی کمزوریوں اور بے بسی کی بنیاد ہے۔ یہ مجبوری حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے عورت یا مادہ کمتر اور بے چاری ہے اور اپنے سے برتر مرد پر اپنے اور اپنے بچوں کی کفالت کے لئے انحصار کرتی ہے۔ گویا عورتوں کی تمام تر مجبوری اور محکومی فطرت کے سر تھوپ دی گئی ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے مرد اور عورت مختلف ہیں، چونکہ عورت ہی بچہ پیدا کرنے کے اعضاء رکھتی ہے اور بچہ جنتی ہے۔ لیکن اس باعث یہ کہنا غلط ہے کہ عورت کی مظلومیت یا کمتری کی ذمہ داری فطرت پر ہے۔ بلکہ عورت کی اس حالت کی تمام تر ذمہ داری مردوں کے بنائے ہوئے اُن اداروں اور قوانین پر ہے جو طبقات میں منقسم پدرانہ سماج میں رائج ہیں اور جو سماج طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ یہ صورت حال نہ تو حیوانوں میں پائی جاتی ہے نہ ہی دور قدیم کی اس سوسائٹی میں جس میں طبقات کا وجود نہ تھا۔

جنسیت پرست سوسائٹی کی عیب پوشی کے لئے تاریخ کے فطری اور سماجی پہلوؤں کو بھی خوب بڑھا چڑھا کر غلط انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ عورت کی مظلومیت کو اس کی جسمانی ساخت کی وجہ سے حق بجانب قرار دیا جاتا ہے کہ یہ اسکا مقدر ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ جب عورت کی مشکلات اسکی جسمانی ساخت کی بنا پر ہے پھر بھلا اس کی آزادی اور مظلومیت سے نجات کی جدوجہد کی کیا ضرورت ہے؟ جب وہ اپنی ساخت تبدیل نہیں کر سکتی تو اس کے سماجی حالات بدلنے سے کیا فائدہ؟ یہ بات پالنے ہی سے مسلسل ہر وقت اور ہر ممکن ذریعے سے عورت کے دماغ میں ٹھونس دی جاتی ہے۔ اگر اُن بزرگ مردوں کی بات مانی جائے جو سائنسدانی کا بہروپ بھی بھرتے ہیں تو ماننا پڑے گا کہ جسمیات عورت کا مقدر ہے اور بہتر ہوگا کہ عورتیں اس حقیقت کو تسلیم

کرلیں اور ہتھیار ڈالدیں ۔

درحقیقت یہ کہنا تو اتنا ہی غلط ہے کہ جسمانی ساخت عورت کا مقدر ہے جتنا کہ یہ کہنا کہ جسمانی ساخت مرد کا مقدّر ہے ۔ اسطرح تو ہم انسان کو حیوانی سطح پر لے آتے ہیں ۔ پھر اگر عورت محض افزائش نسل کرتی ہے تو مرد بھی محض ایک سانڈ بن جاتا ہے ۔ ایسی سطحی سوچ سے ہم اس فیصلہ کن امتیاز کو ختم کر دیتے ہیں جو حیوان اور انسان کے درمیان ہے ۔ اپنے حیوانی اصل اور اس دور کی زندگی کو چھوڑے مدتوں گزریں انسان نے ارتقا کی منزلیں طے کر کے سماجی زندگی گزارنی شروع کی ہے ۔ مرد اور عورت میں جو اختلافات ہیں انہیں سمجھنے کے لئے ہمیں پہلے انسانوں اور حیوانوں میں اس امتیاز کا جائزہ لینا ہوگا جو انسان کو ایک غیر معمولی اور بالکل نئی مخلوق بناتے ہیں ۔

انسان ایک بے مثال جنس

جس وقت سے ڈاروِن نے اپنا یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ انسان کا ایک برتر قسم کے بن مانس سے ارتقا ہوا ہے بے شمار مضامین حیوان اور انسان کی مشابہت اور یکسانیت پر لکھے جا چکے ہیں ۔ لیکن اس موضوع پر کہ انسان اور حیوان میں کسقدر زبردست امتیاز ہے اس کی اہمیت کے باوجود بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے ۔ حالانکہ یہی امتیاز انسان کو ہر قسم کے حیوان سے بلند و بالا اور ایک غیر معمولی جنس بناتا ہے ۔

مارکس کے ماننے والوں نے انسان کے اسی غیر معمولی پن کے اصل منبع کی نشاندھی کی ہے ۔ شعوری محنت اور ضروریات زندگی کی پیداواری صلاحیت یہ دونوں باتیں کسی حیوان میں نہیں پائی جاتیں ۔ انسان کے ارتقاء کے سلسلے میں اینگلس نے نظریہ محنت اپنے اُس مضمون میں پیش کیا جس کا عنوان تھا ’’بن مانس سے انسان تک ارتقا میں محنت کا کردار‘‘ ۔

آج آثار قدیمہ اور بشریات کے بڑے بڑے ماہر مثلاً، واشبرن، ہوول، اوکلے اور گورڈن چائلڈ اور دیگر ماہرین اوزار سازی کی انسانی قابلیت کو وہ انسانی خصوصیت تسلیم کرتے ہیں جو اسے دیگر حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے ۔ واشبرن کے مطابق انسان کے ارتقا کی

کی ابتداہی اولین نہایت سادہ قسم کے اوزاروں کی ساخت سے ہوتی جس نے اسے آج کی مہذب دنیا تک پہنچایا۔ گورڈن چائلڈ اینگلز ہی کی بات دہراتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ تاریخ سے قبل کے آثار قدیمہ ظاہر کرتے ہیں کہ محنت ہی سے آدمی انسان بن پایا۔

جو لوگ محنت کی اہمیت کو گھٹاتے ہیں وہ اکثر یہ کہتے ہیں کہ بن مانس بھی قدرتی اشیاء کو اوزار کی طرح استعمال کرتے ہیں چنانچہ یہ کہنا درست نہیں کہ ہمارے انسان بننے میں محنت کوئی بنیادی حقیقت ہے۔ لیکن یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ بن مانس اپنے ہاتھوں کے استعمال میں چاہے کتنے ہی ہوشیار ہوں یا انہیں سدھایا جاسکے لیکن ان میں سے کوئی بھی خود اوزار نہیں بنا سکتا۔ حیوانوں میں محنت کی تقسیم جنس کی بنیاد پر نہیں پائی جاتی اسی طرح انسانی ارتقاء سے پہلے زندہ رہنے کی خاطر منظم محنت کا رواج بھی نہ تھا۔ بقول آدمسن ہوبل "پنجے جن سے نوچا جائے، ہاتھ جن سے نوچی ہوئی خوراک منہ تک پہنچائی جائے، یہ تھی ہمارے بشریاتی رشتہ داروں کی تکنیک"

اس کے برعکس انسان کا محنت پر اسقدر انحصار ہے کہ اگر اس کی پیداواری قابلیت ختم ہو جائے تو بہت جلد بطور ایک جنس اسکا وجود بھی ختم ہو جائے۔ ایک بے مثال جنس، یعنی انسان کی زیست اور ترقی محض اس کی محنت کی صلاحیت اور پیداواری سرگرمیوں کی وجہ سے ہے۔ ہم محض افزائش نسل ہی میں مصروف نہیں بلکہ ضروریات زندگی کو بھی پیدا کرتے ہیں۔

انسان اور فطرت کے باہمی تعلقات میں انسانی محنت سے زبردست تبدیلی واقع ہوئی ہے جس سے پیداوار کی اہمیت بھی جھلکتی ہے۔ بنیادی طور پر حیوان جسمانی عوامل کی وجہ سے فطرت پر حاوی نہیں ہو پاتے بلکہ اس کے آگے بے بس ہوتے ہیں۔ لیکن انسان نے اس سلسلے کو الٹا کر دیا ہے۔ انسان نے اپنی محنت کے ذریعہ فطرت پر اثر انداز ہونا سیکھ لیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک جنس یعنی انسان نہ صرف اب جسمانی ساخت کی براہ راست پابندیوں سے نجات حاصل کر سکا بلکہ اپنے سابقہ حاکم یعنی فطرت پر بھی قابو پا سکا۔ کہا جاتا ہے کہ حیوانوں کی تاریخ تو ان کے لئے لکھی جاتی ہے لیکن انسان وہ واحد جنس ہے جو خود اپنی تاریخ بناتا ہے۔

فطرت پر قابض ہونے کے ساتھ ساتھ انسان نے نئی نئی ضروریات کی طلب بھی پیدا کر لی اور یہ وہ خصوصیت ہے جو جانوروں میں نہیں پائی جاتی۔ جانوروں کی ضروریات خوراک اور افزائش نسل تک محدود ہیں جب کہ انسان کی طلب خواہشات اور ضروریات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو کلچر کے میدان میں زیادہ واضح ہے۔ صنعت کی دنیا سے اگر ہم مثال لیں تو دیکھئے کیسے انسان نے پہلے مٹھے والی کلہاڑی سے آگے چل کر دستے والی کلہاڑی کی ضرورت محسوس کی۔ کھردری لکڑی سے شروع ہو کر زمین کھودنے کے لئے ہل ایجاد کیا۔ معمولی چرخے اور تکلی نے موجودہ دور کی کپڑا بننے کی مشینوں کو جنم دیا۔ تعمیراتی ضروریات نے گھاس پھوس کی جھونپڑیوں سے گزر کر شاندار کارخانوں اور فلک بوس عمارتوں کی شکل اختیار کر لی۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے تیز رفتاری کی ضرورت نے بیل گاڑی کو معدوم کر کے دخانی جہاز، ٹرین، موٹر، ہوائی جہاز اور خلائی جہاز کو جنم دیا۔

سماجی زندگی میں انسانوں کے آپس کے تعلقات اور نئی سرگرمیوں کے جزو کے طور پر تعلیم، سائنس اور آرٹ کے میدانوں میں نئی نئی کلچرل ضروریات ظاہر ہونے لگیں یہاں تک کہ انسان کی زندگی میں خوراک اور جنس جیسی بنیادی ضرورتوں کو بھی تبدیل ہونا پڑا۔ انسان کے کھانے، جنسی تعلقات اور افزائش نسل کے عمل جانوروں سے مختلف ہیں اور ان کا انحصار انکے بدلتے ہوئے معاشرتی معیار پر ہے۔ جیسا کہ مارکس نے کہا تھا "بھوک تو بھوک ہی ہوتی ہے مگر وہ بھوک جو پکا پکایا گوشت چھری کانٹے سے کھا کر دور کی جائے، اُس بھوک سے بہت مختلف ہوتی ہے جسے ہاتھ، ناخن اور دانتوں کی مدد سے کچی گوشت کھا کر مٹایا جائے"۔

انسانی فطرت کے بیرونی مظاہر یعنی اپنے گرد و پیش میں جو بڑی اہم تبدیلیاں لایا ہے اُس کے ساتھ ساتھ اتنی ہی اہم تبدیلیاں خود اُس کی اندرونی فطرت میں بھی رونما ہوئی ہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ انسان نے اپنے جسم سے بالوں کا لبادہ اُتار پھینکا اور اپنی بندر نما خصوصیت سے چھٹکارہ حاصل کر لیا ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ جانوروں کی طرح ہر چیز پر

ردعمل ظاہر کرنے کی بجائے اب انسان کی سماجی فطرت ردعمل کی بنیاد ٹھہری۔ آج ہم میں تقریباً وہ تمام حیوانی خصوصیات جو ابتدا میں انسان میں پائی جاتی تھیں، کی جگہ سیکھنے کی خصوصیت نے لے لی ہے۔

یہ مختصر تبصرہ جس میں ہم نے انسان اور دیگر انواع کے درمیان اہم امتیاز کو اجاگر کیا ہے اس قصے کو جھٹلانے کے لئے کافی ہے جس کے مطابق انسان بھی ایک جانور ہی ہے بس تھوڑا سا مختلف۔

یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ اگرچہ اب تک ہماری چند جسمانی خصوصیات جانوروں سے مشابہ ہیں لیکن ہم نے اپنے آپ کو اُن کی محدود زندگی سے بلند تر کر لیا ہے۔ ہم اپنی قوت محنت، پیداواری عمل اور سماجی قوتوں سے اتنا زیادہ بنتے اور تبدیل ہوتے گئے ہیں کہ اب ہم نے جسمانی بناوٹ کی غلامی سے نجات حاصل کر لی ہے۔

انسان کے ارتقا کا سرچشمہ درحقیقت یہی تھا کہ انسان سماجی جسمانی ساخت کی براہ راست گرفت سے آزادی حاصل کر چکا تھا۔ انسان کی سماجی زندگی کی جڑیں کلچر میں ہیں نہ کہ جسمانی ساخت میں۔ ہم اسی مقام سے اس من گھڑت قصے کو جھٹلانے کا آغاز کرتے ہیں جیسے مطابق جسمانی ساخت عورت کا مقدر ہے۔

عورت کی کمتری کی دلیل میں "نظریہ رحم"

بشریات کی طرح حیاتیات بھی ایک نوعمر سائنس ہے اور اس کی بھی غلط توضیح ہو سکتی ہے اور سطحی نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں اور سنجیدہ سماجی اور سیاسی، پہلو والے سوالات کے جواب میں سفید جھوٹ سے کام لیا جا سکتا ہے جبکہ بہت سارے حیاتیات اور بشریات کے بہت سے ماہر سرمایہ دارانہ تصورات اور ذہنیت سے مغلوب ہیں چنانچہ عورت کے بارے میں سچائی کی جستجو میں ہمیں دوہری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ عورت تو رحم لیکر پیدا ہوئی ہے جسکی وجہ سے وہ کبھی بھی براہ راست جسمانی پابندی سے نجات نہیں پا سکتی

اور ہمیشہ اپنے افزائش کے فعل کی غلام رہے گی۔

لیکن عورت کی کمتری کی دلیل میں اوپر والا نظریہ اتنا ہی کمزور ہے جتنی کہ وہ دلیل جو مرد کی برتری کے ثبوت میں اسکی جسمانی ساخت کے بارے میں پیش کی جائے۔ نہ جانے کیوں بلاکسی سبب عورت اور مرد کی افزائش نسل میں جسمانی ساخت کے فرق کی بنا پر یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ دونوں کی صلاحتیں مختلف ہیں۔ عورت اپنے رحم کی وجہ سے کم عقل ہے۔ چنانچہ ذہنی ترقی سے قاصر، تہذیبی اور دیگر صلاحتیں حاصل کرنا اس کے لئے مشکل ہیں۔ دوسری طرف مرد اپنی خصوصی جسمانی ساخت کی وجہ سے اور رحم کی مجبوریوں سے آزاد ہونے کی بنا پر اپنے ذہن اور اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بڑھا سکتا ہے۔ یہ دونوں باتیں من گھڑت ہیں اور ان کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حیوانوں کی دنیا میں مرد اپنی فطرت سے مجبور ہے نہ کہ عورت، اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد فطرتاً اپنے جنسی رجحانات میں انتشار پسند خاصیت رکھتا ہے۔ مطالعے اور مشاہدے سے ہم جانتے ہیں کہ مادہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے حیوانات میں نر آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور ان کے درمیان سخت مقابلہ رہتا ہے۔ گو اسے اکثر "رقابت" یا حسد کہا جاتا ہے لیکن صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو یہ الفاظ مناسب نہیں چونکہ یہ جھگڑا کسی خاص مادہ کے حصول کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک وحشیانہ جھگڑالو اندرونی جذبہ ہوتا ہے جسمیں نجی پسند یا محبت کا دخل نہیں ہوتا۔ بعض حیوانات تو محض ایسے مقام پر جگہ حاصل کرنے کے لئے لڑتے ہیں جہاں انکی نسل کی مادہ جانوروں کا بسیرا ہوتا ہے۔ بعض تو ایسے بھی ہیں جو مادہ کی غیر موجودگی میں بھی آپس میں لڑتے ہیں بالخصوص جب ان کا مستی کا دور ہوتا ہے۔

حیوانوں کی دنیا میں اپنی جھگڑالو جنسی خصوصیات کی وجہ سے نر علیحدگی پسند، انفرادیت پسند اور اجتماعی طرز زندگی اختیار کرنے والے گروہوں میں شریک ہونے کا اہل نہیں ہوتا بہت ہوا تو وہ ایک چراگاہ میں یا افزائش نسل والے علاقہ میں ایک دوسرے کی موجودگی برداشت

کر لیتے ہیں۔ بعض جانور بالخصوص بڑے درندے اکیلا گھومتے ہیں۔ نروں کی آپس میں تعاون کرنے سے فطری مجبوری انکی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بنتی ہے۔

دوسری جانب اپنے مادرانہ عمل کی وجہ سے عورت ایسی مجبوری سے بچی ہوئی ہے۔ عورت اجتماعی زندگی کی ابتدا اپنی اولاد کے ساتھ کرتی ہے اور ایسا ماحول بناتی ہے جسمیں تعاون پروان چڑھتا ہے اور خاندانی رشتے گہرے ہوتے ہیں۔ بعض حیوانات میں مثلاً بندروں میں بلکہ شیرنیوں تک میں بھی بہت ساری مادائیں اور ان کے بچے سب مل کر ایک جگہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نر جانور جینے کی جنگ میں صرف اپنی فکر کرتا ہے جبکہ مادہ اپنے مادرانہ جذبے کی وجہ سے اپنی اولاد کی پرورش اور تحفظ کے لیے بھی اتنی ہی جدوجہد کرتی ہے جتنی خود اپنی بقا کے لیے۔ اجتماعی امور میں مسلسل عمل دخل کیوجہ سے مادہ عموماً زیادہ ذہین سوجھ بوجھ والی چالاک اور حالات سے نبرد آزما ہونے کے قابل ہوتی ہے شکاری اکثر مادہ جانور خاص طور پر بچے والی مادہ کی ان خصوصیات کا اعتراف کرتے ہیں اور ایسے جانور کا شکار کرتے وقت احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہیں مادرانہ ذہانت کا سب سے اونچا معیار دودھ پلانے والے جانوروں میں پایا جاتا ہے جو لمبے عرصے تک نوزائیدہ بچے کی پرورش کرتے ہیں جن کی سب سے بڑی مثال بندر ہیں۔ رابرٹ آرڈرے جو خود مردوں کی برتری کا دعوے دار ہے اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے جب وہ کہتا ہے "عالم حیوانات میں جتنا ہم اوپر کیطرف دیکھتے ہیں ہمیں نر سے زیادہ مادہ قوی نظر آتی ہے۔ مدتوں سے نر کا الجھا ہوا ذہن مادہ کی برتر قوت کی بنیاد بنا ہے" بریفالٹ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ نر حیوان مادہ حیوان سے کہیں زیادہ کند ذہن ہوتا ہے۔

ان باتوں پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام فطرت میں عورت کو کم تر درجہ دینے کا "نظریہ رحم" بے بنیاد ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو فطرت عورت کے حق میں جانب دار ہے چونکہ اس پر نسل کی بقا کا دارومدار ہے۔ زندہ رہنے کی جدوجہد میں مادرانہ فرائض کی انجام دہی نے عورت کو زیادہ کارآمد بنایا اور اسی امر نے ہمارے آباؤ اجداد کو فطری طریقوں پر زندگی کے لیے جدوجہد

کے دور سے گزر کر اپنی محنت کی کارکردگی کے ذریعے لقائے انسانی کی منزل تک پہنچا یا بندر سے انسان تک کے ارتقائی دور میں عورت مرد سے کہیں زیادہ پیش پیش رہی ہے۔ شروع سے زیادہ قابلیت اور باہمی تعاون کی خصوصیات رکھنے کی وجہ سے عورت نے زندگی کی ضروریات پیدا کرنے میں پہل کی اور اس طرح ایک نئے اور بے مثال انسان کی ابتدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ حیوانی دنیا میں ماداؤں کے مل جل کر رہنے کے طریقے نے قدیم انسانی سماج میں مادرانہ قبائلی نظام یا سادے لفظوں میں مادرانہ نظام کو جنم دیا۔ اس کے سینکڑوں سال بعد ہی جب پدرانہ طبقاتی نظام وجود میں آیا ، سوفت عورت سے اس کی سماجی زندگی کی حاصل کردہ اعلیٰ انسانی قدریں چھین لی گئیں اور اسے حیوانوں کی سطح پر لاکر محض مادرانہ فرائض سونپ دیئے گئے۔ نجی ملکیت اور خاندان کی بنیاد پر قائم ہونے والے سماج میں جس میں مرد کو برتری حاصل تھی عورت کی جسمانی ساخت یعنی اسکا رحم اور بچہ جننے کی قابلیت کو ایک ایسی استحصالی ظلم اور جبر کی زنجیر میں ڈھال دیا گیا جس میں وہ آج تک جکڑی ہوئی ہے۔ لیکن اس کی اس حالت کی ذمہ داری فطرت پر نہیں عائد ہوتی بلکہ اسکا تمام تر ذمہ دار مرد ہے۔

جو لوگ عورتوں کی کمتری کے سلسلے میں "نظریۂ رحم" کے قائل ہیں وہ اکثر اپنے نظریئے کی حمایت میں ایک اور اتنا ہی غلط نظریہ مرد کی نہ ختم ہونے والی برتری کا بھی پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ حیاتیات کی سائنس BIOLOGY کو گرا کر قصہ کہانی کی سطح پر لے آتے ہیں جس میں ہمارے دور کے پدرانہ نظام پر قائم خاندان کو ویسے ہی پیش کیا جاتا ہے جیسا کہ حیوانی دنیا میں ہے۔ ان کے نزدیک حیوانی خاندان

میں انسان کے خاندان کی طرح ایک نر خاندان کا بڑا ہوتا ہے اور اس کی مادہ اور بچے اپنی حفاظت اور خوراک کے لیئے اس کے دست نگر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ برتر ہے۔ اس حیوانی ہیرو کو "حاکم نر" کا لقب بھی دیا جاتا ہے۔ اوپر جن قصہ کہانی لکھنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہمارے سماج میں بھی شوہر اور باپ کو اسی روپ میں پیش کرتے ہیں جیسا کہ حیوانوں میں انہیں نر کا کردار دکھائی دیتا ہے بلکہ ان میں سے زیادہ پر کیف تصور رکھنے والے اس نر حیوان کو کچھ

اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسا حکمران ہے جسکا اپنا حرم ہو کئی بیویاں، داشتائیں اور غلام عورتیں ہوں اور ان سب کی زندگی اور قسمتوں کا وہی فیصلہ کرنے والا۔ تصور کی اس اڑان کے پیچھے حقیقت کیا ہے؟

"حاکم نر" حقیقت اور افسانہ

حیوانوں کی دنیا میں "برتر نر" کا فطری مظہر موجود ہے چونکہ جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس دنیا میں نر بہت جھگڑالو ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں گتھم گتھا رہتے ہیں جنسی محاذ پر بھی ہر نر کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے حریفوں کو پسپا کرکے اوّلیت حاصل کرلے۔ جو فاتح ہوتا ہے وہ دوسرے نروں پر بھی برتری حاصل کرتا ہے کم از کم وقتی طور پر یا اسوقت تک کے لیئے جب تک کہ اسے کوئی اور قوی تر نر پسپا نہ کردے۔

اس برتری کی لڑائی میں ایک خاص بات عام طور پر یا تو بھلا دیجاتی ہے یا بگاڑ کر پیش کی جاتی ہے کہ یہ لڑائی محض نروں کے درمیان ہے۔ جب برتر نر اپنے حریفوں کو پسپا کر چکا ہوتا ہے تب بھی اسے کسی ایک مادہ یا مادؤں پر برتری حاصل نہیں ہوجاتی صرف رسائی ہوتی ہے جہاں تک ان مادؤں کا تعلق ہے وہ کامیاب نر کو محض سانڈ کے طور پر قبول کرسکتی ہے اور بالآخر یہ رضامندی بھی حاملہ ہونے کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے جب وہ تمام نروں کو چھوڑ کر اپنی زچگی کی تیاری اور ننھے بچوں کی پرورش میں مشغول ہوجاتی ہے۔ نروں کی آپس کی لڑائی کے نتیجوں سے قطع نظر مادائیں خود اپنے طور پر بالکل خود کفیل ہوتی ہیں اور نر کی مدد کے بغیر اولاد کی نگہداشت کرتی ہیں۔

وہ لوگ جو اپنے آپکو سائنس داں کہتے ہیں اور بچوں کے لیئے کہانیاں بھی لکھتے ہیں وہ حیوانوں کی دنیا میں خاندان کا پدری نظام رائج دکھاتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بعض چڑیائیں اور مچھلیاں ایسی بھی ہیں جن کے نر انڈوں کی حفاظت میں شرکت کرتے ہیں۔ لیکن یہ خاندانی عمل نہیں ہوتا بلکہ تخلیقی عمل کا جزو ہے۔ حیوانی مخلوق کی بھاری اکثریت

اور ان میں بھی خاص طور پر دودھ پلانے والے حیوانات جن سے انسانی ارتقا کا براہ راست ناطہ جوڑا جاسکتا ہے، سب میں دیکھا گیا ہے کہ مادہ ہی اپنے بچوں کی نگہداشت کرتی ہے۔ بریفالٹ کا کہنا ہے کہ ہر عمر رسیدہ حیوان چاہے نر ہو یا مادہ اپنی ضروریات خود پوری کرتی ہے اور یہ صرف ماں ہی ہوتی ہے جو اپنے بچوں کی کفالت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں حیوانوں کی دنیا میں نر کی جنسی جارحیت اور جھگڑالو پن اس کے خاندانی پدرانہ کردار میں رکاوٹ ہے۔ صرف انسانوں ہی کی دنیا میں ہم مرد کو خاندان میں عورت کی طرح ذمہ داری کا کردار ادا کرتے دیکھتے ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہوا جب انسانی سماج میں مرد نے اپنے حیوانی جسمانی خصوصیات سے نجات حاصل کرلی اور نئی اونچی قدریں اپنالی۔ سماجی زندگی نے مرد کے جنسی رویّہ میں تبدیلی پیدا کردی اور بعد میں اس نے پدرانہ فرائض انجام دینا شروع کردیئے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ نر لڑ سکتا ہے اس لئے وہ خاندان کی حفاظت بھی کرسکتا ہے۔ یہ بھی من گھڑت قصّہ ہے یہ سچ ہے کہ بعض جانوروں میں نر مادا ؤں اور بچوں کے ارد گرد چکر لگاتے رہتے ہیں لیکن یاد رہے کہ ایسا کرتے ہوئے یہ نر مادا ؤں یا بچوں کے لئے نہیں لڑتے بلکہ خود اپنی زندگی کے لئے لڑتے ہیں۔

حیوانوں کی دنیا میں ہر ایک اپنی جان کی حفاظت کے لئے یا تو لڑتا ہے یا بھاگ کھڑا ہوتا ہے سوائے مادہ کے جو اپنی اولاد کے خاطر سینہ سپر ہو جاتی ہے۔ گویا حیوانی خاندان محض ایک چھوٹا سا مادرانہ نظام ہوتا ہے جس میں حفاظت اور کفالت دونوں فرائض مادہ انجام دیتی ہے۔ ہمارے سماج کے پدرانہ خاندان سے اس کی کوئی مشابہت نہیں جہاں پر باپ خاندان کا محافظ اور کفیل ہوتا ہے اور حاکم بھی۔

ایک اور عام دلیل جو مرد کی برتری کے طور پر عموماً پیش کیجاتی ہے وہ یہ ہے کہ حیوانوں میں نر جسمانی طور پر گوشت پوست اور ڈھانچے کے اعتبار سے مادہ سے بڑا ہوتا ہے اس میں

شبہ نہیں کہ اس بڑے پن کی وجہ نر کی مسلسل جارحانہ اور جھگڑالو فطرت ہے، ہنیری نسن کا کہنا ہے "جسمانی طور پر جو جانور قد و قامت میں دوسروں سے بڑا ہوتا ہے وہ اتنا ہی دوسروں سے بڑھ کر کھاتا ہے اور ایک قسم کے حیوان میں جو قوی ترین نر ہوتا ہے اس کی ماداؤں تک رسائی آسان ہوتی ہے"، لیکن اس سے یہ باور کر لینا غلط ہوگا کہ مرد کی جسمانی گوشت پوست کی طاقت کیوجہ سے اسے عورت پر کوئی فضیلت حاصل ہے گو کہ اس کی جسمانی طاقت اسے دوسرے کمزور مردوں سے برتر بنا سکتی ہے۔

فطری اعتبار سے کسی نر کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ مادہ ہی کرتی ہے خواہ وہ نر قوی تر ہی کیوں نہ ہو۔

پھر یہ قبولیت بھی صرف اتنے ہی عرصے کے لئے ہوتی ہے جب تک مادہ محسوس کرتی ہے کہ نر کی موجودگی اس کے لئے تکلیف کا باعث نہیں ہے نہ ہی اس کی وجہ سے اسے کوئی پریشانی ہے۔ اسکا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب مادہ بچے جننے والی ہوتی ہے تو نر اسے بالکل اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔

ہم نے دیکھ لیا کہ وہ لوگ کس قدر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں جو حیوانی دنیا میں بھی عورت کو بے بس دکھلاتے ہیں جو جینے کے لئے اور تحفظ کے لئے اپنے باپ یا اپنے شوہر کی مرہون منت ہے۔ پدرانہ نظام خاندان تو خاص طور پر ایک انسانی ادارہ ہے جو ہماری معاشرتی تاریخ میں بہت دیر کے بعد نجی ملکیت اور طبقات کے قیام کے ساتھ ساتھ وجود میں آیا۔ نظریۂ رحم اور حیوانی پدرانہ نظام یہ دونوں من گھڑت قصّے ساتھ ساتھ چلائے گئے "تاکہ عورت کو کمتر ثابت کیا جائے۔ عورت کی مظلومیت کے بنیادی سماجی حقائق کو پوشیدہ رکھنے کے لئے جان بوجھ کر حیاتیات اور حیوانیات کی سائنس کو مسخ کیا گیا ہے۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ حیاتیات کو مسخ کرنے والوں نے بشریات کا کیسے سہارا لیا ہے۔

عورت کی کمتری کا "نظریہ شکار"

اس نظریہ کی بنیاد پہلی تقسیم محنت پر ہے جو مرد اور عورت کے درمیان وجود میں آئی تھی جس کے مطابق مرد کا کام شکار کرنا اور جنگ کرنا ہوتا تھا جبکہ عورت کا کام خوراک مہیا کرنا اور پڑاؤ یا گھر کے دوسرے امور نمٹانا تھا۔ شکاری مرد کے کردار کو بہت اعلیٰ دکھلایا جاتا تھا جبکہ عورت کی محنت کو گھٹیا سمجھ کر پیش کیا جاتا تھا۔ اپنی مادرانہ مجبوریوں کی وجہ سے عورت پڑاؤ یا رہائش گاہ نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ محنت کی اس قدیم تقسیم میں زیادہ اہم کردار شکاری مرد کا نہ تھا بلکہ گھریلو عورت کا تھا۔ سب سے پہلے خوراک ہی کو لیجئے جو ایک بنیادی ضرورت ہے اور جسے پورا کئے بغیر دوسرے کام ہو نہیں سکتے تھے۔ مرد شکاریوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ خوراک جمع کرتی تھیں۔ شکار خطرناک بھی ہوتا تھا اور مرد کئی مرتبہ خالی ہاتھ لوٹتے تھے ایسے میں عورتوں کی جمع کی ہوئی خوراک ہی کام آتی تھی۔ خوراک پر عورتوں کا ہی قبضہ ہوتا تھا جو نہ صرف روزمرہ کی ضرورت کے لئے اسے تیار کرتی تھیں بلکہ آئندہ کے لئے بھی پس انداز کر چھوڑتی تھیں۔ عورتیں قدیم اشتمالی سماج کی ریڑھ کی ہڈی تھیں۔

مگر یہ تو صرف عورت کے کام کی ابتدا تھی۔ یہاں پر قدیم دور میں عورت کی جفاکشی کے کردار پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ جس دوران مرد خوراک کے لئے شکار میں مصروف ہوتا تھا عورت اسی عرصے میں چمڑے کی چیزیں بن مٹی کے برتن بناتی تھی۔ مختلف دست کاریاں کرتی تھی۔ جڑی بوٹیوں کو آزماتی تھی اور سائنسی علوم کی ابتدائی تشکیل کر رہی تھی۔ ایک جانب لکڑی کے نوکیلے ٹکڑے سے زمین کی کھدائی کر کے کاشتکاری کی ابتداء کی تو دوسری طرف عورت ہی نے جنگلی جانوروں کو پالتو بنا کر خوراک کے لئے ان کی افزائش کو بھی فروغ دیا۔ یہی وہ اہم اقدامات تھے جو تہذیب انسانی کی بنیاد بنے اور جنہوں نے انسان کو شکار کی صعوبتوں سے نجات دلائی اور اعلیٰ قسم کے پیداواری عمل کے قابل

بنایا۔ چنانچہ یہ صاف ظاہر ہے کہ پہلی بار جب جنس کی بنیاد پر محنت کی تقسیم ہوئی تو اہم کردار مرد شکاری کا نہ تھا بلکہ عورت کا تھا۔

مردوں کی برتری کے دعویدار قدیم سماج میں عورت کے پیداواری عمل کی اہمیت کو نظر انداز کرنے میں بڑی ناانصافی کے مرتکب ہوتے ہیں اور اسے محض ایک گھریلو کام کی نوعیت دیتے ہیں۔ اس دور میں جداگانہ الگ تھلگ خاندانوں کا وجود ہی نہ تھا نہ ہی کوئی ایسا صاحب جائداد حکمران طبقہ تھا جو عورتوں کو اپنی محنت کا صلہ حاصل کرنے کے لئے خاندان کی غلامی پر مجبور کرے قدیم گھرانے ایک طرح سے سماجی زندگی کا محور ہوتے تھے۔ اور اپنے زمانے کی فیکٹری، درسگاہ، تجربہ گاہ اور دواخانہ اجتماع گھر سب ہی کچھ تھے۔ اس دور کے مادرانہ نظام میں اشتمالی طور پر کام کرنے والی عورت آج کے دور کی عورت سے بہت مختلف تھی جبکہ موجودہ دور کی عورت کا محور اس کے گھر کی محدود دنیا ہے۔

یہاں پر ہمارا مقصد مرد کی اُس قابلیت کو جھٹلانا نہیں ہے جو اس نے اپنے شکار کے پیشے میں حاصل کی تھی۔ بلکہ ہم صرف توازن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور مرد کی محنت کو اس کے صحیح مقام پر اور پس منظر میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت نہ صرف عورت کے کام کی اہمیت کو جھٹلایا گیا ہے بلکہ مرد کی شکار کرنے کی محنت کی بھی پوری طرح قدر نہیں کی گئی۔

اپنے اس دور کے سماجی اور معاشی ارتقاء کی مناسبت سے مخصوص حالات میں محنت کی تقسیم کے تقاضے کے مطابق مردوں اور عورتوں میں کام بانٹ دیا جاتا تھا کئی لکھنے والوں نے مردوں کے شکار کے کارنامے کو عورت کے کاموں پر زیادہ فوقیت دی عورت کو محض خوراک جمع کرنے والا گھٹیا کام کرتے دیکھا ہے جب کہ مرد کو جنسی اعتبار سے برتر جری شکاری اور سپاہی کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔

ایک اور امریکی جانبدار سائنسدان بھی مردوں کی حمایت کرتا ہے چونکہ اس کے خیال میں عورت کے راستے میں حمل اور بچوں کی پرورش دو بڑی رکاوٹیں ہیں جبکہ دور قدیم کا مرد

اپنی تیز رفتاری اور جسمانی طاقت کی وجہ سے شکار جیسا اہم کام انجام دے سکتا تھا۔

ہم یہ بات تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ مردوں کی لڑاکو عادتوں نے انہیں شکاری بننے میں کافی سہولت پیدا کر دی، لیکن ہم اس خیال کو رد کرتے ہیں کہ عورتیں اپنے رحم کی وجہ سے جسمانی اعتبار سے شکار کرنے سے قاصر ہے۔ اس مغالطے کو بڑی آسانی سے جھٹلایا جا سکتا ہے اگر ہم حیوانوں کی دنیا پر نظر ڈالیں، جہاں پر درندوں میں مادہ بھی اتنی ہی اچھی شکاری ہوتی ہے جتنا کہ نر۔ شیر اور چیتے کی مادہ کے راستے میں شکار کے دوران اس کا رحم مانع نہیں آتا اور نہ ہی کسی مجبوری کا باعث بنتا ہے۔

البتہ انسان کا ارتقا درندوں سے نہیں بلکہ خوراک جمع کرنے والے بن مانس سے ہوا ہے لیکن عورتوں کے لئے جو اپنی کمتری کے "نظریہ کے شکار،، کو رد کرنا چاہتی ہوں یہ ضروری نہیں کہ وہ اُن سارے اسباب کی گتھیاں سلجھائیں جن کی وجہ سے سب سے پہلی محنت کی تقسیم میں انہیں شکار کا کام نہیں سونپا گیا تھا۔ اتنا ہی کافی ہوگا اگر مردوں کے مقابلے میں عورتیں جو کہیں زیادہ اہم اور مختلف کام انجام دیتی تھیں انہیں اُجاگر کیا جائے۔ چاہے اس کی کوئی بھی وجہ کیوں نہ ہو لیکن مختلف سرگرمیوں میں سے صرف ایک کام عورتوں نے مردوں کے لئے چھوڑ دیا تھا یعنی شکار کا۔

بالآخر ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی کمتری کے سلسلے میں "نظریہ شکار،، اتنا ہی مہمل ہے جتنا کہ "نظریہ رحم،، جس کے ذریعہ سے یہ نظریہ وجود میں آیا تھا۔ ایک نظریہ بشریات کی غلط تشریح کرتا ہے تو دوسرا نظریہ حیاتیات کی۔ لیکن یہی تشریح جعلی سائنس والوں کو عورتوں کی کمتری کے لئے پراپیگنڈہ کرنے کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔

کیا عورت ہمیشہ مظلوم رہی ہے

عورتوں کی آزادی کی تحریک کے ابھرنے کے دوران بعض غیر سائنسی نظریات سے مرعوب ہو کر کچھ بشریات کے ماہر اور خواتین قلم کار بعض قنوطی نتائج اخذ کرنے لگے ہیں۔

انکا کہنا ہے کہ عورت تاریخ میں ہمیشہ مظلوم رہی ہے نہ کہ صرف پدرانہ نظام کے دور میں۔ انکا خیال ہے کہ زمانۂ قدیم میں اگر وہ پدرانہ دور کی طرح اپنے باپ اور شوہر کے ظلم سے آزاد تھی تو وہ اپنے بھائیوں چچا ماموں وغیرہ کی طابع تھی۔

دنیا کے مختلف حصوں میں قدیم طرز کے کچھ ایسے معاشرے آج بھی پائے جاتے ہیں جہاں پر کم و بیش مادرانہ نظام کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان معاشروں میں شجرۂ نسب ماں کی طرف سے بنایا جاتا ہے۔ ان معاشروں میں ماموں کا وہی کردار ہوتا تھا جو پدرانہ نظام میں باپ کا ہوتا ہے۔

یہ بچے کھچے معاشرے مادرانہ نظام کی باقیات میں سے ہی ہیں اور پدرانہ نظام سے متاثر ہو کر تبدیلیاں پاکر بھی پچھلے سماجی نظام کی ترجیحات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پچھلی صدی میں جب بشریات کے ماہرین نے اپنا کام شروع کیا۔ اس وقت تک بیشتر قدیمی قبائل کا ڈھانچہ بدل چکا تھا۔ پہلے جن قبائل میں ماں اور ماموں یا بہنوں اور بھائیوں سے ایک خاندان کی پہچان ہوتی تھی اب ان کی جگہ ایسے خاندانوں کا رواج چل پڑا جنہیں مارگن "جوڑی دار خاندان" کہتا ہے۔

لیکن اس قسم کا خاندان بھی اب تک مادرانہ اجتماعی نظام کا ایک حصہ تھا جو اس پدرانہ خاندان سے بالکل مختلف تھا جسے طبقاتی سماج نے جنم دیا۔ قبیلے سے باہر کا ایک مرد مادرانہ گروہ میں ایک عورت کے شوہر کی حیثیت سے داخل ہوتا تھا۔ جو بیوی بچوں کی کفالت تو کرسکتا تھا لیکن اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ خاندان میں اہمیت ماں کے بھائی کی ہوا کرتی تھی۔

بشریات کے میدانی ماہر جب تاریخی نظریے سے قدیم قبائلی گروہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اپنے آپ کو بڑی پریشانی میں مبتلا پاتے ہیں۔ ٹروبریانڈ کے جزیرے کے لوگوں کے بارے میں مالینوسکی کہتا ہے کہ ان کے ہاں تمام خاندانی اور سماجی رشتے قانوناً مادرانہ نسب سے شمار کئے جاتے تھے اور عورتیں قبائلی نہ صرف روز مرہ کے کاموں میں بھرپور حصہ لیتی تھیں بلکہ

معاشرتی اور جادو ٹونے کی سرگرمیوں میں بھی آگے آگے رہتی تھیں۔

لیکن چونکہ اس جزیرے کے لوگوں میں جوڑی دار خاندان کا رواج پوری طرح قائم تھا، مالینوسکی گھوم گھام کر اس رواج میں باپ کے مقام کو تلاش کر رہا تھا مگر دیکھا جائے تو اس سوسائٹی میں اُس وقت تک ماں کے شوہر کو صحیح معنوں میں باپ کا مرتبہ نہیں حاصل ہوا تھا۔ لفظ "ٹاما" کے مطلب مالینوسکی کے مطابق باپ کے ہوتے ہیں۔ مگر مقامی باشندوں کے مطابق اس کا ترجمہ "میری ماں کا شوہر" ہے بعض دفعہ یہ لفظ "ٹاما کاوا" بن جاتا ہے یعنی اجنبی یا باہر سے آنے والا۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ آدمی ہوتا تھا جو خاندان میں باہر سے داخل ہوتا تھا اور جس کی پہچان بعض مقامات پر ماں کے شوہر کی حیثیت سے تو بنتی تھی مگر باپ ہونے کے ناتے اسکا کوئی رتبہ نہ تھا۔

وہ مرد جو بچوں کی (خاص طور پر اولادِ نرینہ کی) نگہداشت کرتا تھا وہ ماں کا بھائی ہوا کرتا تھا۔

مالینوسکی کہتا ہے کہ اس قبیلے میں سماجی مقام بھی مادرانہ نسبت سے حاصل ہوتا تھا جو ایک شخص سے اس کی بہن کی اولاد کو پہنچایا جاتا تھا اور رشتے داری کا یہ تصور بڑی اہمیت رکھتا ہے چونکہ مادرانہ رشتے داری سے آپس میں تعلقات گہرے ہوتے ہیں اور مقاصد اور دلچسپیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اس گروہ میں شادی کے رشتے سے یا باپ بیٹے کے ناتے سے خاندانی وابستگی کا وجود ہے ہی نہیں۔

ازدواجی رشتے کے نتیجے میں مادرانہ رشتوں والے قبیلے پر جو دوہرا اثر پڑا اس کی طرف مالینوسکی یہاں خاص طور پر متوجہ کرتا ہے۔ چونکہ اولادِ نرینہ اب خاندان میں دو مردوں کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کے درمیان اپنے آپ کو بٹا ہوا محسوس کرتے ہیں، ایک جانب پرانا طے شدہ ماں کا بھائی یعنی ماموں ہوتا ہے تو دوسری طرف نووارد ماں کا شوہر، لیکن مالینوسکی جو اہم بات جتلا نہ سکا تھا وہ یہ تھی کہ اس جزیرے کے لوگ مادرانہ

نظام سے پدرانہ نظام کے ارتقائی دور میں تھے۔

پچھلی صدی میں بشریات کے اوّلین ماہرین نے کئی ایسے قبیلوں کا کھوج لگایا جو مادرانہ رشتوں والی سماجی تنظیم سے گزر کر پدرانہ نظام کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مادرانہ حقوق پر پدرانہ حاکمیت نے مستقبل دست درازی کی ہے اور ہمیں مادرانہ ادارے ارتقائی دور میں نظر آتے ہیں۔

ان پچھلے قبیلوں میں جو ابھی ارتقاء کے دور میں تھے عورتوں کی حیثیت تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ انکو سماج میں باعزت مقام اور معاشی آزادی دونوں حاصل تھے۔ لیکن جہاں پر پدرانہ رشتے بااثر ہو رہے تھے وہاں معیشت پر مرد کا غلبہ تھا اور عورت کا مقام اتنا ہی گرا ہوا تھا جتنا کہ طبقاتی سماج میں تھا۔ ان علاقوں میں نہ صرف باپ اور شوہر بلکہ بھائی بھی ظلم کرنے میں شریک ہوتا تھا۔

قدیم عورت کی مظلومیت کی مثال میں اکثر آسٹریلیا کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن سپنسر اور گلن کے مطابق موجودہ حالت اور زمانۂ قدیم کے روایتی دور کے حالات کے درمیان بڑا فاصلہ ہے۔ پرانے دور میں عورتوں کا مقام موجودہ دور سے کہیں بلند تھا اور بالکل مختلف۔

رابرٹ بریفالٹ مختلف جائزوں کو سمیٹتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ پدریت، مرد کی بالادستی اور عورت کی حقیر حیثیت یہ ساری باتیں نسبتاً نئی ہیں اور انہوں نے عورتوں کی پچھلی پُر وقار اور بااثر حیثیت کی جگہ لے لی ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ آسٹریلیا کے مقامی باشندے نہ صرف قدیمی ہیں بلکہ کئی طرح سے ایک زوال پذیر نسل بھی ہیں اور اسی وجہ سے مرد کی بالادستی ان کے ہاں رواج پاتے ہی اپنے انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ ایک ایسے براعظم میں جہاں پر گورے آدمی کے آنے کے بعد سے بیماریوں اور دوسری وجوہات کی بنا پر مقامی باشندوں کی آبادی سو سال کے اندر پانچ لاکھ سے گھٹ کر صرف پچاس ہزار رہ گئی ہے، یہ چنداں حیرت کی بات نہیں ہے۔

اس کے برعکس کئی ایسے علاقے ہیں جہاں پر اب بھی مادرانہ رسوم و رواج برقرار ہیں اور نہ تو عورت کو حقیر گردانا جاتا ہے نہ مرد کو۔ شمالی امریکہ کے ریڈ انڈین قبیلوں میں نہ تو عورت مظلوم ہوتی تھی نہ مرد کی بالادستی تھی، لیکن جب یورپ سے آنے والے مہذب باشندوں نے ان کی زمینیں بندوقوں اور شراب کے عوض خریدنی شروع کیں تو صورت حال بدلنے لگی۔

"عورت برتر ہے اس سے بڑھ کر کوئی حقیقت نہیں۔ عورت ہی تو ہے جس سے قوم بنتی ہے، شجرۂ نسب بنتا ہے، آنے والی نسل تربیت پاتی ہے اور خاندانوں کا تحفظ ہوتا ہے۔ حقیقی حاکمیت عورت ہی کی ہے اور ملک کھیت کھلیان سارے انہی کے ہیں۔ وہ مشاورت کی جان ہیں جنگ اور امن کا فیصلہ چکانا انہیں کا کام ہے" (ریڈ انڈین عوام کی قدیم دستاویز لافیتو)

گولڈن کے مطابق عورتیں سرداروں کے انتخاب پر بھی اثر انداز ہوتی تھیں اور وہ ان سرداروں کی تمام کارکردگی پر نظر رکھتی تھیں اور نگرانی کرتی تھیں۔ بالخصوص جنگ کے معاملے میں بزرگ عورتیں مطمئن نہ ہونے پر سرداروں کو برطرف بھی کر دیتی تھیں گروہ میں عوامی رائے مردوں کی نسبت عورتوں سے قائم ہوا کرتی تھی۔ آگے چل کر یہی مصنف کہتا ہے "نہ جانے کتنی تباہ کن جنگوں سے ان بزرگ خواتین کے مشوروں نے لوگوں کو بچایا ہوگا" زمینوں کی خرید کے سلسلے میں نوآبادیاتی حکومتوں نے جن دستاویزات تیار کیے ہیں ان میں سے بیشتر پر عورتوں کے دستخط اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس دور میں عورتوں کو بالادستی حاصل تھی۔

برلیفالٹ امریکہ کے ریڈ انڈین قبیلے اروقوا سے تعلق رکھنے والے ایک مرد اور گورنر کلنٹن کے درمیان مقالمے سے بعض اقتباسات پیش کرتا ہے۔ یہ شخص سفید فام یورپی باشندوں کو مخاطب کرتے اُن سے سفید فاموں کے رویے کی شکایت کرتا ہے جو عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انہیں بتاتا ہے کہ ریڈ انڈین عورتوں کا کس قدر احترام کرتے ہیں۔

"بھائیو ہمارے بزرگ عورتوں کے مشورے کو، بالخصوص مادر مہتمم کے مشوروں کو

ٹھکرانا ہتک آمیز سمجھتے تھے۔ وہ دھرتی سے بیاہی ہوئی تھیں۔ کون کہتا ہے ہمارے باپ دادا کی وجہ سے ہم دنیا میں آئے ہیں؟ ہماری زمین کون کاشت کرتا ہے، آگ کون دہکاتا ہے، کھانا کون تیار کرتا ہے سوائے عورت کے؟ میرے بھائی ہماری عورتیں کہتی ہیں کہ وہ آپ سے خطرہ محسوس کرتی ہیں۔ وہ عاجزی سے کہتی ہیں کہ عورت کا جس طرح ان کے بزرگوں نے احترام کیا تھا اسے نظر انداز نہ کیا جائے، ہمیں حقارت سے نہ دیکھا جائے، روحِ عظیم نے ہمیں بنایا ہے۔ مادرِ مہتمم چاہتی ہیں کہ ان کی بولنے کی وہی آزادی برقرار رہے جو ان کے بزرگوں کی ارواح کو منظور تھی چونکہ وہی تو قوم کی جان ہیں،،

بریفالٹ لکھتا ہے "یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ کیا طور طریقے ہونگے جنہیں اختیار کرکے عورتوں کو ایسے لوگوں پر مکمل تسلط حاصل ہو گیا جو اپنی لاقانونیت اور بربریت اور کسی کی ماتحتی نہ قبول کرنے پر مشہور تھی"۔

یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ عورتیں ابد سے مظلوم رہی ہیں۔ یہ حقیقت کہ بعض قدیم علاقوں میں عورتوں پر اتنا ہی ظلم روا رکھا گیا تھا جتنا کہ پدرانہ نظام والے مہذب اقوام میں رائج تھا، لیکن اس سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ عورتیں سدا سے مظلوم ہیں۔ اس سے اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ کچھ علاقوں میں (سب میں نہیں) ماں اور بہن کا رتبہ گھٹنے کے ساتھ ساتھ ماموں کا رتبہ بھی گھٹ گیا۔ اب یہ ہوا کہ پدرانہ سماج میں ظلم کرنے والے مردوں کو مثال بنا کے ماں کے کچھ بھائی ایسے بھی تھے جو اب عورتوں پر اپنی برتری جتلانے اور انپر ظلم بھی کرنے لگے تھے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو پدرانہ نظام مسلط ہونے سے پہلے عورت پر مرد کی بالادستی کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ اور نہ ہی اس کے برعکس عورت مرد پر حاوی تھی۔ قبیلہ واری خاندان میں ایک قسم کا اشتمالی نظام رائج تھا یعنی مردوں کی برابری اور عورتوں کا بہناپا۔ زندگی کے ہر شعبے میں (معاشرتی، سماجی، جنسی) معاشرے کا ڈھانچہ مساوات پر قائم تھا۔ گویا عورتیں ہمیشہ سے مظلوم نہ تھیں۔ عورتوں کی مظلومیت اُس ظالمانہ سوسائٹی کا ایک جزوی حصہ تھا جس نے قدیم

اشتمالی مادرانہ نظام کو الٹ کر اس کی جگہ لے لی۔ نظریہ رحم کی طرح عورت کی منتقل مظلومیت کے ثبوت میں قرابت کا نظریہ بھی محض ایک زیادہ خوبصورت ڈھونگ رچانے کی کوشش ہے۔ آزادی نسواں کی تحریک میں شریک خواتین کو چاہیئے کہ ان دونوں نظریوں کو ٹھکرا دیں۔

بدقسمتی سے بعض نامور اور با اثر خواتین بھی ان نظریات سے دھوکا کھا گئی ہیں مثلاً کیٹ ملیٹ۔ یہ خواتین کی جدوجہد میں شریک تھیں اور جسمانی ساخت کو عورت کی کمزوری ماننے سے منکر تھیں۔ لیکن بشریات کے ماہرین کی کچھ غیر تاریخی باتوں سے متاثر ہو گئی تھیں۔ اپنی کتاب "جنس کی سیاست" میں وہ لکھتی ہیں کہ قدیم اور مہذب دنیا دونوں مردوں کی دنیائیں ہیں۔ اور یہ کہ عورتوں پر ہمیشہ ظلم ہوتا رہا ہے یا تو پدرانہ نظام والے مردوں کی طرف سے یا قرابتی (ماموں یا چچا) خاندانی کے لوگوں ..... کی جانب سے عجیب بات یہ ہے کہ وہ ساتھ ساتھ یہ اقرار بھی کرتی ہیں کہ انہیں اس بات کا علم ہی نہیں کہ تاریخ میں کبھی مادرانہ دور بھی رہا ہے۔

فائرسٹون اپنی کتاب "مابعد الطبیعیات جنس" میں عورتوں کی ابدی مظلومیت کے بارے میں اور بھی بھاری غلطی کی مرتکب ہوتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں مردوں کی ساختہ راگنی الاپتی ہے۔ اس کے مطابق عورت کی مظلومیت لکھی ہوئی تاریخ سے زیادہ قدیم ہے اور اس کے آثار حیوانوں کی دنیا میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اسکا کہنا ہے کہ اپنی جسمانی ساخت کی وجہ سے عورت میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ پیداواری کاموں میں حصہ لے لیکن یہ بات کہہ کر وہ دور قدیم کی عورتوں کی بے پایاں محنت کی تاریخ سے بے خبر ہو کر اپنی جہالت ثابت کرتی ہے۔ پھر وہ یہ بھی کہتی ہے کہ عورت اپنی جسمانی ساخت کی وجہ سے زندگی کی پُراسرار تبدیلیوں کی غلام رہی ہے در اصل فائرسٹون عورت کے افزائش نسل اور بچے کی پرورش والے مخصوص کردار والی مردوں کی کہی ہوئی باتوں کو دہراتی ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ عورتیں ہمیشہ اپنی جسمانی ساخت کے رحم وکرم پر رہی ہیں جس کی وجہ سے انہیں مردوں پر انحصار کرنا پڑا ہے چاہے یہ مرد انکا قبیلہ دار، بھائی ہو یا شوہر یا باپ۔

فائرسٹون سراسر نظریہ رحم کا شکار ہوگئی۔ وہ مارکس اور اینگلز کو شمار میں نہیں لاتی وہ کہتی ہے کہ انہیں ایک مظلوم طبقے کی حیثیت سے عورت کے متعلق نہ ہونے کے برابر علم تھا اور وہ بضد ہے کہ عورت کی مظلومیت اس کی بچہ پیدا کرنے والی جسمانی ساخت کی وجہ سے ہے نہ کہ پدرانہ نظام جیسے انقلاب کے اچانک برپا ہونے کی وجہ سے۔ دراصل حقائق کا تنقیدی جائزہ لئے بغیر فائرسٹون طوطے کی طرح عورتوں کے خلاف صف آرا، مردوں کی بات دہراتی ہے۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ موضوع سے واقفیت کے باوجود کچھ خواتین ماہر بشریات بھی ایسی ہی غلطیاں کر بیٹھی ہیں۔ اس کی وجہ شاید وہ ماحول ہے جو ماہرین کے حلقے میں رائج مردوں کی برتری اور بورژوا آئیڈیولوجی ہے جس سے یہ خواتین ماہرین مرعوب ہوتی ہیں یا ڈر جاتی ہیں اور وہ بھی اس افسانے میں یقین کرنے لگتی ہیں کہ عورتیں ہمیشہ سے کمتر اور مظلوم رہی ہیں۔ انگریز ماہر بشریات لوسی میئر کہتی ہیں "سیدھے سادے نظام والے سماجوں میں تو کیا بلکہ بعض صنعتی طور پر ترقی یافتہ سماج میں بھی عورتیں کبھی مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتیں"، وہ ہمیشہ مردوں پر انحصار کرتی ہیں چاہے وہ بھائی ہوں، شوہر ہوں یا باپ۔ یہ بلا جھجک دعوے کے ساتھ کہی ہوئی بات اُن پچھلے مادرانہ رشتے والے خاندانوں پر بھی صادق نہیں آتی جہاں پر عورتیں اب بھی سماج میں عزت کا مقام رکھتی ہیں اور انہیں لین دین کی آزادی حاصل ہے۔ لوسی میئر کا یہ دعویٰ اُس دور کے لئے غلط ہے جب کہ .... سماجی تنظیم میں مادرانہ نظام رائج تھا اور مردوں کو برتری حاصل نہ ہوئی تھی۔

کیتھلین ابرلے اپنی کتاب مادرانہ رشتے میں بہت عمدہ باتیں لکھتی ہیں لیکن وہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ عورتیں ہمیشہ مظلوم رہی ہیں۔ عورتوں کی آزادی کی تحریک کے لئے ایک مضمون میں وہ لکھتی ہیں "مرد جس باقاعدہ طریقے سے عورتوں کا استحصال کرتے ہیں اسکی وجہ ارتکاز زر ہے جس کی پشت پناہی ریاست کرتی ہے"۔ یہاں تک تو وہ مارکسی نظریے سے البتہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اُس وقت وہ تاریخی مادیت کے راستے سے ہٹ جاتی ہے، جب وہ کہتی

ہے "شکاری سوسائٹی میں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض باتوں میں عورت کا درجہ دوسری جنس کا تھا اور وہ کم و بیش مردوں کے ماتحت تھی"

یہ بات کچھ شکاری خاندانوں کی حد تک درست ہو سکتی ہے جو ماضی قریب میں اپنی حالت بدل چکے ہیں۔ لیکن مادرانہ اشتمالی دور کے شکاری خاندانوں پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ ہم پورے وثوق سے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مردوں کو اپنے شکار کرنے کی قابلیت کی وجہ سے عورت پر کوئی برتری حاصل نہیں ہوئی۔ مرد کی برتری اور عورت کی مظلومیت کی وجہ نجی ملکیت کی ابتدا طبقاتی تقسیم اور پدرانہ نظام ہیں۔

محنت کی سماجی اور خاندانی تقسیم کا موازنہ

اب ہم اُس مقام پر پہنچتے ہیں جہاں پر ہمیں اس افسانے کی گتھیوں کو سلجھانا ہے جس کے مطابق عورت دوسرے درجے کی کمتر جنس ہے۔ اس کا تعلق دور قدیم میں اور آج کی مہذب دنیا میں عورت اور مرد کے درمیان محنت کی تقسیم میں جو واضح فرق ہے اسے ظاہر کرنا ہے۔ موجودہ پراپیگنڈے کے مطابق یہ تقسیم ہمیشہ سے یکساں رہی ہے یعنی عورت کا کام گھر اور خاندان تک محدود رہا ہے۔ انسان کی تاریخ کی ابتدا ہی سے یہ باور کیا جاتا ہے کہ میاں اور بیوی کے درمیان محنت کی تقسیم ہر خاندان میں ہوا کرتی تھی۔ شوہر باہر کام کے لئے جاتا ہے جب کہ بیوی گھر ہی پر رہتی ہے تاکہ بچوں کی نگہداشت کر سکے اور گھر کے کام کاج میں حصہ لینے والی کچھ خواتین اس بات پر بہت بگڑتی ہیں کہ مرد کو تو اس کی محنت کی اُجرت ملتی ہے لیکن عورت کو اس کے کام کا معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ لیکن اس ناانصافی کی جڑیں اور بھی زیادہ گہری ہیں۔ اسمیں چار دیواری میں پابند خواب اور کاموں میں مصروف مجبور عورتوں کی ہر طرح سے بنجر زندگی کا بڑا دخل ہے۔

عورتوں کو ایسے اجتماعی کاموں سے محروم رکھا جاتا ہے جن کے ذریعہ انہیں معاشی آزادی حاصل ہو سکے۔ ایسے کام بیشتر مردوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ اچھی خاتون ہونے کے لئے شادی اور خاندان کو زندگی کا نصب العین بنانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ ضبطِ تولید اور

اسقاطِ حمل کے رجعت پرست قوانین اور رسم و رواج کی وجہ سے اپنی مرضی اور خواہش کے برخلاف عورتیں بچے جننے پر مجبور ہوتی ہیں پھر بچوں کی نگہداشت کے مراکز کی عدم موجودگی بھی بچوں کو پالنے پوسنے کا کام ایک بوجھ بنا دیتی ہے۔

مذہبی اجارہ دار اور سرکاری لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ خاندان کا وجود ہمیشہ سے رہا ہے اس لئے عورت کی جگہ گھر ہے جہاں پر اسے میاں اور بچوں کی خدمت کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ تصور غلط ہے چونکہ افزائش نسل کا عمل ایک فطری عمل ہے جبکہ خاندان کا ادارہ انسان کا بنایا ہوا ہے۔ عورتیں ہمیشہ سے افزائش نسل کرتی رہی ہیں لیکن وہ ہمیشہ کسی ایک اکائی میں الگ تھلگ ایک ہی شوہر اور خاندان سے وابستہ نہیں رہی ہیں۔ عورتوں کی کمتری میں نظریہ رحم پیش کرنے والوں کا آخری حربہ یہی ابدی خاندان کا نظریہ ہے۔

عورت اور مرد کے درمیان محنت کی پہلی تقسیم شوہر اور بیوی کے درمیان نہ تھی جیسا کہ آج کل عام ہے کہ مرد باہر کام کرتے ہیں جبکہ عورتیں گھریلو کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ سماجی محنت قدیم زمانے میں عورت اور مرد دونوں کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ یہ اس وجہ سے ممکن تھا چونکہ وہ اشتمالی طریقہ پیداوار اختیار کرتے تھے اور ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم اور نگہداشت کا طریقہ بھی اشتمالی تھا۔ عورتیں لڑکیوں کو مستقبل کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرتی تھیں جب کہ لڑکوں کو مردوں کے سپرد کر دیا جاتا تھا جو ان کے استاد اور نگراں کے فرائض انجام دیتے تھے پیداواری عمل اور افزائشِ نسل، دونوں جنسوں کے مشترکہ سماجی فعل تھے۔ جب مادرانہ اشتمالی نظام زوال پذیر ہوا اور وہ سماجی پیداواری عمل جس میں شرکت کی بنا پر دونوں جنسوں میں برابری تھی اس سے عورت کو خارج کر دیا گیا تب ہی سے خاندان میں عورت کی غلامی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اب مردوں نے محنت کی نئی تقسیم کو رائج کیا۔

مورخین کا کہنا ہے کہ زراعت اور مویشیوں کی افزائش کی بنا پر اب ایک نئی معیشت نے جنم لیا جس میں پہلے والی جنس کی بنیاد پر محنت کی تقسیم کی بجائے نئے سرے سے محنت کی تقسیم عمل میں

آئی۔ مثال کے طور پر جانور پالنے والے کسانوں سے، دھات کا کام کرنے والوں، معماروں سے کشتی اور جہاز بنانے والوں، جولاہوں اور کمہاروں سے غرض ہر پیشہ ور ایک دوسرے سے الگ تھا۔ محنت کی اس پیشہ ورانہ تقسیم کے ساتھ ساتھ ثقافتی تقسیم بھی عمل میں آئی جیسے کہ پجاری، سائنسدان، مصور اور سنگ تراش وغیرہ

اس عمل کے دوران دونوں جنسوں کے کردار کی ہئیت میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جیسے جیسے محنت کی تقسیم اور مزید تقسیم ہوتی گئی اور پھیلتی گئی عورتیں مردوں کے ماتحت ہوتی گئیں اور بالآخر مکمل طور پر محکوم ہو گئیں۔ عورتوں کو ثقافتی اور سماجی کاموں سے ہٹا کر گھر اور خاندان کے کاموں میں الجھا دیا گیا۔ ریاست اور کلیسا کی بڑھتی ہوئی قوتوں نے بھی عورتوں کو یہ درس دیا کہ ان کی زندگیوں کا دائرہ کار ان کے گھروں تک محدود ہے اور انہیں سب سے بہتر وہ ہیں جو شکایت کئے بغیر خوشی سے اپنے شوہروں اور خاندانوں کی خدمت کرتی ہیں۔ عورت کی پستی اور مرد کی بلندی کے ساتھ ساتھ نہ صرف عورتوں کو سماجی پیداوار میں اپنا پچھلا مقام کھونا پڑا بلکہ وہ بچوں کی نگہداشت کے قدیم اشتمالی نظام سے بھی محروم ہو گئیں۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ عام نچلے طبقے کی عورتیں ہمیشہ محنت اور مشقت کرتی رہی ہیں۔ زراعتی دور میں عورتیں کھیتوں پر اور گھریلو صنعتوں میں کام کرتی تھیں، ساتھ ساتھ وہ بچے بھی پیدا کرتی تھیں اور گھر کے کام کاج سے بھی نمٹتی تھیں لیکن ایک اشتمالی سماج میں کی گئی اشتمالی محنت اس محنت سے بہت مختلف ہوتی ہے جو اپنے گھر میں کی جائے یا صرف اپنے خاندان میں کیجائے یا صرف اپنے شوہر کی خاطر۔ سماجی پیداوار میں حصہ لینے سے ذہن اور جسم دونوں کی نشوونما ہوتی ہے جبکہ سماج سے کٹ کر اپنے انفرادی اکتا دینے والے گھریلو کاموں میں محو ہو جانے سے ذہن اور جسم دونوں کی نشوونما سکڑ کر رہ جاتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں مرد و عورت کے درمیان محنت کی تقسیم ہمیشہ سے یکساں نہیں رہی ہے۔ طبقاتی سماج، نجی ملکیت اور پدرانہ نظام مردوں کی بالادستی پر مبنی محنت

کی جس تقسیم کو جنم دیا وہی عورتوں کے عظیم استحصال اور نقصان کا باعث بنا۔

"نظریہ رحم" اور "ابدی خاندان" جیسے من گھڑت افسانوں کو جھٹلانا جن کے ذریعہ عورتوں کی مظلومیت برقرار رکھی جاتی ہے محض سائنس اور تاریخ کی سچائیوں کو ہی اجاگر ہی نہیں کرتا بلکہ اس سے عورتوں کی آزادی کی تحریک پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مردوں کی برتری کے دعوے داروں کا سب سے بڑا ہتھیار عورت کی جسمانی ساخت ہی ہے اگر اس بات کو بے بنیاد ثابت کردیں تو ان کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔

فطرتاً مرد کے مقابلے میں عورت اپنی جسمانی ساخت کی وجہ سے کسی طرح مجبور نہیں غیر طبقاتی سماج میں عورت کا مقام گھٹایا بھی نہیں گیا تھا بلکہ انکی پیداواری اور افزائش نسل والے دوہرے کردار کی وجہ سے انکا خاص احترام کیا جاتا تھا۔ گویا بدلتے ہوئے تاریخی حالات نے عورت کے مقام کو مختلف شکلیں دی ہیں۔ جس عظیم تبدیلی نے مادرانہ اشتراکیت کی کایا پلٹ کردی وہی عورت کی پستی کا باعث بنی۔ پدرانہ طبقاتی سماج کے فروغ کے ساتھ ساتھ عورت کی جسمانی ساخت کو بہانہ بنا کر اسے مسلسل سماجی اور ثقافتی زندگی کے دھاروں سے محروم کرکے محکوم بنا ڈالا گیا۔

صرف حقائق سے آگاہ ہو کر ہی خواتین اُن اسباب کو دور کر سکتی ہیں جو اُن کی محکومی اور ذلت کا باعث ہیں اور جن کی جڑیں سرمایہ دارانہ نظام میں پیوست ہیں۔ آزادیِ نسواں کی جدوجہد اُس وقت تک بارآور ثابت نہیں ہو سکتی جب تک ہم سماج اور نظام کی بجائے فطرت کو اپنی مظلومیت کا ذمہ دار سمجھتے رہیں گے

عورتوں نے پچھلے دنوں ایک مظاہرے میں پھریرا (BANNER) اُٹھا رکھا تھا جس پر لکھا تھا "عورت کا مقدر جسمانی ساخت پر منحصر نہیں"

'BIOLOGY IS NOT WOMAN'S DESTINY

عورتوں کی تحریکِ آزادی کا نعرہ بھی یہی ہونا چاہیئے۔

ترجمہ: ممتاز و ملک نورانی

ہمارے گزشتہ مجموعوں کے موضوعات

پاکستان کے مزدور طبقے کی تاریخ
ریاست اور طبقات

زرعی اصلاحات - ایک جائزہ
صوبہ سرحد کا سماجی ڈھانچہ

عالمی اجارہ داریاں اور پاکستان
پاکستان کا نظام صحت

جدید پنجابی ادب - ایک تاریخی جائزہ
عالمی مزدور تحریک

سندھ ہاری کمیٹی
پاکستان میں مزدور قوانین

پڙهندڙ نسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪَ ”لُڙهندڙ نسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرندڙ، اوسيئڙو ڪندڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياجوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنيٰ e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻڻ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعوىٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳِئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪٻئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَ پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا:

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا:

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،

جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اٽڪاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاٽي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ نادانيءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۾ سماجي حالتن تان نظر ڪڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻجاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، چالاءِ ۽ ڪينئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ڀاڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ڀاءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)